قبائے زرّیں

(آزاد نظمیں)

اثرؔ سعید

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قبائے زرّیں

(آزاد نظمیں)

اثر سعید

نامِ کتاب : قبائے زرّیں

مصنف : آثرؔ سعید

تعلیم : (یم اے)

پیشہ : تجارت

پتہ/کتاب ملنے کا پتہ : # 537 L.I.G -1,
II Stage Rajivnagar,
Mysore 570 019

فون (مکان) : (0821) 2451041

موبائیل : 09448600936
07795031761

ای میل : asarsayeed01@gmail.com

کمپیوٹر کمپوزنگ : مشتاق سعید (M) 08095446180

مطبع :

صفحات : 141

قیمت : 160 روپۓ

تعدادِ اشاعت : 500

سنِ اشاعت : 2014ء

کتاب ملنے کا پتہ : # 537 L.I.G-1
II Stage Rajivnagar
Mysore-570 019
(Karnataka)

قبائے زرّیں

ذہن سے
شکستہ راتوں کی
جھولتی ہوئی
سیاہ چادریں......!
جسم سے
رنجور
دنوں کے چیتھڑے
اُتر چکے ہیں
اب مرے تخیل کو
حاصل ہے
قبائے زرّیں............!!

آثر سعید

آثر سعید - ایک تعارف

نام	:	سید عثمان	
قلمی نام	:	آثر سعید	
والد محترم	:	سید حبیب	
والدہ محترمہ	:	عائشہ بی	
مقامِ پیدائش	:	میسور (کرناٹک)	
تاریخ پیدائش	:	15/ اپریل 1958ء	
مطبوعہ تصانیف	:	۱) مسافتِ ہجراں	افسانوں کا مجموعہ
		۲) اوراقِ زرّیں	غزلیں
		۳) زرّیں... یادوں کے نقوش	افسانوں کا مجموعہ
زیرِ نظر	:	قبائے زرّیں......	آزاد نظموں کا مجموعہ

انتساب

محسنِ ادب

ڈاکٹر بی محمد داؤد محسنؔ

کے نام

جن کی شفقت نے قبائے زرّیں

عطا کی

اور

اُن شب و روز کے

تلخ تجربوں کے

نام

جو میرے غم خوار

اور

رفیقِ حیات رہے

فہرست

آزاد نظمیں

صفحہ نمبر

آزاد نظمیں

صفحہ نمبر

آزاد نظمیں

صفحہ نمبر

آزاد نظمیں

صفحہ نمبر

آزاد نظمیں

صفحہ نمبر

تقریظ

ڈاکٹر بی محمد داؤد محسن ایم۔اے، پی ایچ۔ڈی
پرنسپال
ایس۔کے۔اے۔ایچ ملت پری یونیورسٹی کالج
داونگرے۔577001 (کرناٹک)
سیل:09449202211
e-mail : drmohameddavood@gmail.com

دورِ حاضر میں ادبی اُفق پر نہ جانے کتنے صاحبِ قلم مثلِ آفتاب و ماہتاب اپنی فنی کاوشوں کے نور و تابانی کے باعث سندِ افتخار و اعزاز کے حامل نظر آتے ہیں۔ جن کی خدماتِ علم و فن یقیناً ادب کے روشن مستقبل کو تابناک رکھنے کے لئے نہایت معاون ہیں۔ ایسی شخصیات کا تعلق زندگی کے ہر شعبہ سے ہے جو اپنی روزمرہ مصروفیات کے علاوہ ادب کی خدمت کو مقصدِ حیات بنائے ہوئے ہیں۔ انہیں افراد میں آثر سعید کی شخصیت بھی ایک ہے جو دن رات زندگی کی گاڑی کھینچتے ہوئے ادب سے اِس قدر جڑا ہوا ہے کہ وہ اپنے تجربات و مشاہدات اور تصورات و تخیلات کے اظہار کے لئے الگ الگ پیرائے تلاش کرتا ہے۔ کبھی وہ افسانے لکھ کر سماج و معاشرہ

میں پنپنے والے مسائل کا نہ صرف اظہار کرتا ہے بلکہ اس کا حتی المقدور جواز بھی پیش کرنے کی سعی کرتا ہے، کبھی غزلیں کہہ کر اپنے دل کو تسلی دے لیتا ہے جب ''کچھ اور چاہیے وسعت میرے بیاں کے لئے'' کا احساس دامن گیر ہوتا ہے تو نظم کو وسیلۂ اظہار بناتا ہے اور اپنے سینے میں اٹھنے والے درد و کرب اور مسرت و انبساط کو صفحۂ قرطاس پر لاتا ہے۔ وہ بھی ''جدید نظم گوئی'' جو کہ عالمی نئی شاعری کے مقابلہ میں رکھی جانے والی صنف ہے۔ ان مختلف اصناف میں طبع آزمائی کرنے والا شخص معمولی ہو سکتا ہے مگر ادبی میدان میں اس کی ذات اور شخصیت کو معمولی نہیں بلکہ غیر معمولی کہا جا سکتا ہے۔ جس کا نام سید عثمان ہے مگر ادبی دنیا اسے آثر سعید کے نام سے جانتی اور پہچانتی ہے۔ دیارِ حضرت ٹیپو سلطان شہیدؒ، محلوں، باغوں اور صندل کی خوشبوؤں، علوم و فنون، امن و آشتی، بہاروں اور پر کیف فضاؤں کا مرکز جو تاریخی، مذہبی، تہذیبی اور ثقافتی اعتبار سے سارے عالم میں مشہور و مقبول میسور کہلاتا ہے۔ اسی شہر میں اگربتی کی فیکٹری چلانے والا سید عثمان ظاہری طور پر ایک سیدھا سادہ مہذب و شائستہ اور نہایت سنجیدہ شخص معلوم ہوتا ہے مگر جب آثر سعید کو دیکھیں، اس کی فنی، فکری اور ذہنی سطح تک پہنچنے کی کوشش کریں تو اس کی فنی صلاحیتوں کا دائرہ وسیع ہے۔ علاوہ ازیں پروازِ فکر کا تنوع اور اس کی جولانیاں سوچنے پر آمادہ کرتی ہیں۔

ادیب و شاعر کی زندگی عملی اور تجرباتی ہوتی ہے، وہ زندگی کی آگ میں تپ کر کندن بنتا ہے۔ وہ عام لوگوں کی طرح زندگی کاٹتا ہے اور نہ ہی زندگی کو عمومی طور پر دیکھتا ہے بلکہ اس کی کربناکیوں اور درد کو سہتے ہوئے اس کے زہر کو گھول کر پی جاتا ہے۔ وہ جن مراحل سے گذرتا ہے، جو دیکھتا ہے، جو محسوس کرتا ہے اسے صفحۂ قرطاس پر اجاگر کرتا ہے، قارئین کو زندگی کا آئینہ دکھاتا ہے اور اپنے دل کو تسلی دے لیتا ہے۔ سماج و معاشرے میں پنپنے والے مسائل کو دیکھ کر وہ چپ نہیں رہ سکتا کیونکہ ان حالات و کیفیات سے اس کا دل بے چین اور بے قرار ہو جاتا ہے اسی لئے وہ قرطاس و قلم کا سہارا لیتا ہے۔ اگر آنکھوں دیکھا حال ہو بہو بیان ہو جائے تو وہ ایک رپورتاژ بن

جائے گا اسی لئے وہ حسین چیز کو حسین تر اور قبیح چیز کو قبیح تر بنا کر پیش کرتا ہے اور یہی ادب کا تقاضا ہے۔ سید عثمان کو آثر سعید بننے، اپنے قلم کا لوہا منوانے میں تیس پینتیس برس لگے ہیں۔ ان سالوں میں وہ عملی اور تجرباتی زندگی سے گذرتے رہے اسی لئے وہ لکھتے ہیں۔

''زندگی کا تجرباتی موڑ بڑا ہی خار دار ثابت ہوا، کئی ایک تلخ تجربات کا سامنا کرنا پڑا۔ انہیں تجربات نے سیّد عثمان سے اثر سعید بننے پر مجبور کیا۔ آثر سعید بننے کے بعد شب و روز یہی کوشش رہی کہ جو درد کا سمندر میرے سینے میں موجزن ہے اسے سمیٹ کر غزلوں، نظموں اور افسانوں میں بھر دوں۔ اور .... جس دن درد کا سمندر سوکھ جائے گا یقین ہے کہ اسی دن میرا فن مجھ سے روٹھ جائے گا۔'' (مسافت ہجراں۔ آثر سعید صفحہ ۱۲)

یہی سادگی، سنجیدگی، سلیقگی اور شائستگی آثر سعید کو جنم دیتی ہے، اس کے اندر کئی ادبی جوہر پیدا کرنے میں معاون و مددگار ثابت ہوتی ہے اور اسے کامیابی و کامرانی سے ہمکنار کر دیتی ہے۔ ایک ذی فہم اور باشعور شخص ہی اندازہ لگا سکتا ہے کہ سید عثمان سے آثر سعید بننے میں کتنا وقت لگا، اسے وقت اور حالات کی چکی میں کتنا پسنا پڑا، کتنے پاپڑ بیلنے پڑے۔ میں تو یہی کہوں گا کہ انہیں سید عثمان سے آثر سعید بننے تک پاؤں سے نہیں سر کے بل چلنا پڑا ہوگا۔ تب کہیں جا کر انہیں اب تک تین کتابیں منظر شہود پر لانے میں کامیابی حاصل ہوئی۔ جن میں دو افسانوی مجموعے ''مسافتِ ہجراں'' (1991) اور ''زرّیں..... یادوں کے نقوش'' اور ایک شعری مجموعہ ''اوراقِ زرّیں'' (1998) ہیں جن کی بدولت آثر سعید کی ادبی دنیا آباد ہی نہیں بلکہ سرسبز و شاداب اور کامیاب بھی ہے اگر تلخ حقائق کی بات کی جائے تو انہیں منظرِ عام پر لانے کی خاطر کئی مراحل سے گذرنا پڑا۔ صد شکر کہ ادبی میدان میں انہیں اطمینان و سکون اور راحتِ قلب نصیب ہوا۔ اسی سکون کی خاطر وہ اپنے سفر کو جاری رکھنے میں کامیاب ہوئے اور اپنی علمی و فنی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے غزل کے گیسو بھی سنوار رہے ہیں، اپنے مشاہدات و تجربات کو افسانوی روپ بھی دے رہے ہیں

اور آزاد نظموں کا جادو بھی جگا رہے ہیں۔ اسی کوشش، اسی جذبہ اور اسی خواہش کا نتیجہ ہے کہ اب ان کا چوتھا مجموعہ ''قبائے زرّیں'' کے نام سے منظر عام پر آرہا ہے جو آزاد نظموں پر مشتمل ہے۔ جس کا مسودہ میرے پیش نظر ہے۔

آثر سعید ایک سلجھے اور منجھے ہوئے بالیدہ فنکار کا نام ہے جو ادب کے بدلتے ہوئے منظر نامہ سے بخوبی واقف ہے اسی لئے وہ اپنے پہلے افسانوی مجموعہ ''مسافتِ ہجراں'' کے پیش لفظ میں رقمطراز ہیں کہ ''میرے ادبی اور شعری نظریات کا جہاں تک تعلق ہے میں صحت مند ادبی رجحانات کا قائل ہوں۔ خواہ وہ روایتی ادب ہو یا ترقی پسند، کیونکہ روایتی ادب کی صالح قدروں پر ہی جدید ادب کی عمارت کھڑی ہے۔''

اگر ہم آثر سعید کے مذکورہ جملہ پر غور کریں تو معلوم ہوگا فنکار روایتی ادب کی صالح قدروں کا پاسدار بھی ہے، ادب کے بدلتے ہوئے رجحانات اور تحریکات سے بخوبی واقف بھی ہے اور اسے اس بات کا شعور بھی ہے کہ اردو میں غزل اور افسانہ کے بعد جدید نظم ہی مشہور و معروف صنفِ شاعری ہے اسی لئے وہ کہتا ہے کہ ''روایتی ادب کی صالح قدروں پر ہی جدید ادب کی عمارت کھڑی ہے۔''

اب جدید ادب کی بات آگئی ہے تو یہ ضروری ہے کہ اس کے تعلق سے تھوڑی گفتگو ہو جائے۔ جہاں تک جدیدیت کا سوال ہے اس کا بیسویں صدی کی ابتدائی دہائیوں میں یوروپ میں آغاز ہو چکا تھا۔ جدیدیت کے اثرات مختلف تحریکات پر اثر انداز ہو رہے تھے۔ اُس زمانے میں ہمارے ملک میں ترقی پسند تحریک کی نیو ڈالی گئی جس کے نتیجے میں ہماری زبان کے ادب میں غیر معمولی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ نئی نئی اصناف اردو میں نہ صرف داخل ہوئیں بلکہ روایتی اصناف ادب میں نئے نئے تجربے ہونے لگے۔ ان اصناف میں نظم کو بڑا فائدہ پہنچا اور نظم نگاری نے ایک نیا موڑ لیا۔ حالانکہ اس سے قبل مولانا حالؔی اور مولانا محمد حسین آزاد نے تجربہ کے طور پر شاعری کو مستحکم

اور جدید شاعری کی شروعات کرنے کی کوششیں کی تھیں ۔ جسے ہم جدید نظمیہ شاعری سے تعبیر کر سکتے ہیں ۔اسی زمانے میں شاعری کے سلسلہ میں بحث ومباحثہ شروع ہوااور یہ بات سامنے آئی کہ اچھا شعر وہ ہے جو لفظی اور معنوی اعتبار سے مربوط ہو، خیال اچھوتا، گہرااورانداز بیان خوبصورت و دلکش ہو ۔اس کے علاوہ اس میں جدّ ت و ندرت ہو۔کیونکہ ہمارے یہاں غزل ہی ایک ایسی مربوط صنفِ شاعری تھی جس میں ہم اپنے جذبات واحساسات اور تخیلات وتصورات کومنظم طور پر پیش کر سکتے تھے اس میں آسانی بھی تھی حالانکہ اس سے قبل غالبؔ کو بھی غزل کی تنگ دامنی کی شکایت تھی ۔

چونکہ ہمارا رشتہ روایتی شاعری سے مستحکم طور پر جڑ چکا تھا۔ جب نئے تجربے ہونے لگے تو بہت سے شعراء نظم نگاری کی طرف راغب ہوئے ۔جس کی بدولت پابند نظم گوئی کے ساتھ ساتھ نظمِ معریٰ جسے بے قافیہ نظم یا نظمِ غیر مقفیٰ بھی کہا گیا، کا سلسلہ شروع ہوا، اسی دوران سانیٹ کے علاوہ اور بھی نئی نئی اصناف اردو میں نئی معنویت کے ساتھ داخل ہوئیں ۔نظم کا جدید تصوّر جو کلاسیکی نظریات سے ہٹ کر ابھرا وہ دراصل مغربی ادب کے اثرات کی دین تھا۔ اکثر شعراء نے اسے پروان چڑھانے میں اہم رول ادا کیا۔ جن میں مولانا الطاف حسین حالؔی سے لے کر نظیر اکبر آبادی ،ڈاکٹر محمد اقبالؔ، اکبرالہ آبادی وغیرہ اہم ہیں ۔ان کے بعد مجازؔ، ساحرؔ لدھیانوی، فیض احمد فیضؔ، کیفیؔ اعظمی کی نظمیہ شاعری کو اردو کا اثاثہ قرار دیا جاسکتا ہے ۔اس کے بعد عالمی ادبی جدید شعری روایات پر مبنی جدید نظم نگاری کی طرف اختر الایمان، ن ۔م راشد اور ان کے ساتھ ساتھ حفیظ ہوشیار پوری، ساغر نظامی، ڈاکٹر تصدق حسین خالدؔ وغیرہ نے ایسی نظمیں لکھیں جو عالمی نئی شاعری کے تقاضوں پر کھری اُترتی ہیں ۔جنہیں جدید نظم نگاری کے بانیوں میں شمار کیا جاتا ہے ۔آگے چل کر کئی اہم شعراء نے اسے اپنایا اور اسے مستحکم کیا۔ دورِ حاضر میں نظم نگاری کا سفر ہیئتی اعتبار سے روایتی اور پابند نظم سے شروع ہو کر ’’ آزاد نظم‘‘ تک پہنچا ہے ۔نثری آہنگ کی نظمیں بھی آہستہ آہستہ ہمارے یہاں رواج پانے لگی ہیں مگر اسے اکثر شعراء وادبا کے علاوہ قارئین نے نہیں اپنایا

جس کے نتیجہ میں یہ ابھی ردوقبول کے درمیان جھول رہی ہے۔ ہمارا اردو شعری مزاج ''نثری نظم'' کو قبول کرنے سے کتراتا رہا ہے۔ جب کہ آج دنیا کی ہر اہم زبان میں ''نثری نظم'' کا رواج عام ہے اور اکثر زبانوں میں اسے بحور وقوافی کی قید سے آزاد کرلیا گیا ہے جسے ان زبانوں کے قارئین اور ناقدین نے قبول بھی کرلیا ہے۔

یہ بات سچ ہے کہ ہر زمانے کے ادب میں اپنے دور کے تقاضات اور حالات کا عمل دخل ہوتا ہے۔ اسی لئے ادب کو زندگی کا آئینہ قرار دیا گیا ہے۔ جدید شاعری خصوصاً جدید نظم بھی اپنے دور کے تقاضات اور حالات کی غماز ہے۔ ہمیں یہ بات بھی نہیں بھولنی چاہیے کہ آج کی بنیاد گذرے ہوئے کل پر ہوتی ہے اسی طرح ہر نئی چیز کی جڑیں کسی نہ کسی طرح روایتی چیزوں سے پیوست ہوتی ہیں لیکن ایک بات ضروری ہے کہ اسے پرانے پیمانوں پر ناپیں اور نہ ان اصولوں پر تولیں، پرانے اصولوں پر اسے جانچنا، تولنا اور پرکھنا عبث ہوگا۔ جس طرح ہم نئی اختراعات اور ایجادات کو نہ چاہتے ہوئے بھی تسلیم کرتے ہیں اسی طرح نئی شاعری کو بھی چیلنج کے طور پر قبول کرنا ہوگا۔ نئی نظم کا آغاز ہوکر تقریباً ایک صدی کا عرصہ گذر چکا ہے مگر اب بھی یہ ردوقبول کے دوراہے پر کھڑی ہے۔ جب کہ ایک صدی سے اکثر شعرا نے آزاد نظم کی طرف خاطر خواہ توجہ دی اور اسے مقبول خاص وعام بنانے کی حتی المقدور کوششیں بھی کیں مگر اردو کا غزل نواز اور پابند نظم کا قائل اور عادی ذہن، جدید وہ بھی 'آزاد نظم' کو ماننے سے کتراتا رہا۔ اس کی اہم وجوہات یہ ہوسکتی ہیں کہ غزلوں اور پابند نظموں میں پائی جانے والی شیرینی، لطافت، نغمگی اور غنائیت آزاد نظموں میں ناپید تھی اس کے علاوہ شعراء نے آزاد نظموں میں سارا زور علامتی، تمثیلی اور استعاراتی نظام پر لگا دیا جس کی بدولت ایسی ایسی نظمیں وجود میں آئیں جن میں معنی ومفہوم کو تلاش کرنا عام قاری کے بس کی بات نہیں تھی اس لئے کہ ان میں سے اکثر نظمیں مبہم، پیچیدہ اور گنجلک تھیں۔ لیکن اب 'کفر ٹوٹا خدا خدا کرکے' کے مصداق اچھی اور سیدھی سادی نظمیں تخلیق پا رہی ہیں جنہیں عام شخص بھی قبول

کرنے پر رضامند ہوتا جارہا ہے۔ اسی لئے دورِ حاضر میں کئی شعراء آزاد نظم گوئی کی طرف راغب ہو رہے ہیں اور اپنی فکر کی جولانیاں دکھا رہے ہیں۔ یہ ایک طویل مسافت طے کرنے کے بعد حاصل ہوا ہے۔ کیونکہ ابتدا میں جو نظمیں کہی گئیں ان میں سے اکثر ہیئتی اعتبار سے روایتی پیرائے اظہار کی حامل تھیں مگر وہ نوعیتی اعتبار سے جدید طرز بیان کی متقاضی تھیں۔ اس کے بعد کی '' آزاد نظم '' بحور و قوافی یا صرف اوزان و بحور کی آزاد روش اختیار کرنے لگی جو علائم اور استعاراتی نظام سے قاری کو مانوس کرواتی رہی۔ اس کے بعد جدید رنگ اُمڈ آیا جس میں نثری آہنگ صاف طور پر چھلکنے لگا اور استعاراتی نظام عروج پر دکھائی دینے لگا اور منطقیانہ اظہار قاری کو گرفت میں لینے لگا۔ اب جب کہ '' آزاد نظم '' کا چلن عام ہوگیا ہے اس کے باوجود اس کی تکنیک سے متعلق بہت سی قیاس آرائیاں ہوتی رہی ہیں۔ آزاد نظم کیسی ہونی چاہیے اور اس کی فنی تعریف کیا ہے کسی نے قطعی طور پر نہیں کی۔ البتہ اس ضمن میں مختلف آرا سامنے آئی ہیں ان میں سے وقار عظیم کی رائے ہے کہ

'' آزاد نظم آزاد ہونے کے باوجود فنی حیثیت سے ایک چیز کی پابند ہے کہ وہ جس بحر میں کہی جائے اس کے مختلف مصروں میں اس بحر کے ارکان کو گھٹا بڑھا کر آہنگ پیدا کیا جائے۔ مثلاً کسی نظم کے ایک مصرعہ کا وزن مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن ہے تو اس کے باقی مصروں میں یہی رکن (مفاعیلن) ایک مرتبہ، دو مرتبہ یا اس سے بھی زیادہ مرتبہ یا اس کی محذوف شکل استعمال کی جائے گی اور پڑھنے والا اس کے مختلف مصروں میں صحیح ربط پیدا کر کے نظم کو پڑھے تو اس میں وہی ترنم اور آہنگ پیدا ہوگا جو اس خاص بحر کے لئے مخصوص ہے۔ ''

جہاں تک آثر سعید کی نظم نگاری کا تعلق ہے ان کی نظموں کے مطالعہ سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ موصوف نے جدید نظم نگاری کے تقاضوں کے تحت نظمیں لکھی ہیں اور پوری دیانت داری کے ساتھ اسے برتا ہے اور اس کی ہئیت اور تکنیک کو بہ حسن و خوبی نباہا ہے۔ آثر سعید اپنی نظموں میں اپنے مافی الضمیر کو علائم و ابہام اور استعاروں کے ذریعہ پردہ ڈالنے، قاری کے ذہن

کو بوجھل بنانے، معنی ومفہوم کو سمجھنے میں کسی طرح کی کوفت یا جھنجلاہٹ پیدا کرنے کے بجائے سیدھے سادے اور نہایت سلیقہ مند انداز میں پیش کرتے ہیں۔جس کی بدولت نظموں میں سلاست وسادگی کے ساتھ ساتھ معنویت پیدا ہو جاتی ہے۔دراصل یہی اچھی اور سچی شاعری کی پہچان ہے۔

آثر سعید ہر نعمت پر شکر الٰہی ادا کرتے ہیں اور راضی بہ رضائے الٰہی (قناعت پسندی) کے قائل ہو کر سیدھی سادی ایمان افروز زندگی گذارنے کے عادی ہیں۔اس لئے ان کی نظموں کے موضوعات شکر، صبر، عجز کے ساتھ ساتھ زندگی کے الجھتے، سلجھتے اور بگڑتے مسائل، حالاتِ حاضرہ اور تہذیبی و ثقافتی روایات سے متعلقہ ہیں۔اسی لئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کی نظمیں ربوبیت اور نبوت کے حقائق کا بیان اور اعتراف بھی ہیں اور رضائے الٰہی اور عشقِ رسولؐ کی امین بھی، دل کی آواز بھی ہیں اور دل کی داستان بھی، زندگی کا نقش بھی ہیں اور زندگی کے کرب کا بیان بھی، زندگی کا نغمہ بھی ہیں اور زندگی کا نوحہ بھی، انسان دوستی، خلوص و وفا اور پیار و محبت کا پیغام بھی ہیں، امن و آشتی کا درس بھی ہیں اور یگانگت، بھائی چارگی کی پاسدار بھی، دوسروں کی خاطر و مدارت والی بھی ہیں اور ان کی خوبیوں کی معترف بھی۔اس لئے کہ ان سے انہیں خوشی اور تسکین ہوتی ہے، جس میں حب الوطنی کے ساتھ ساتھ احترامِ انسانیت کی خوشبو پائی جاتی ہے۔

اردو میں جدید نظم کی ایک خصوصیت اس کا اختصار ہے۔بہت سی نظمیں ایسی ملتی ہیں جو بالکل مختصر ہوتی ہیں مگر وہ معنی ومفاہیم اور جذبہ وتخیل کے سمندر کو کوزہ میں سمیٹ لیتی ہیں۔لہذا آثر سعید کے یہاں بھی مختصر نظمیں پائی جاتی ہیں۔ان نظموں میں وہ اپنی پوری بات بیان کرتے ہیں، تشنگی باقی نہیں رہتی ان میں تاثر بھی پیدا کر دیتے ہیں اور قاری معنی ومفہوم کی گہرائیوں میں پہنچ کر تسکین حاصل کر لیتا ہے۔ان کی نظموں کی خوبی یہ ہے کہ وہ نظم کا آغاز سیدھے سادے انداز میں کر دیتے ہیں مگر جیسے جیسے وہ بیانیہ انداز میں بڑھتی جاتی ہے، معنی ومفہوم کی گرہیں کھلتی جاتی ہیں اور

اختتام پر مقصد ظاہر ہوتا ہے۔ بسا اوقات قاری چونک جاتا ہے اور وہ اطمینان کا سانس لے کر تھوڑی دیر یہ سوچتا ہے کہ شاید یہ فکر، یہ خیال، یہ درد، یہ جذبہ، یہ احساس میرا اپنا ہے جسے شاعر نے شعری روپ عطا کیا ہے۔ میرے اس خیال کے ثبوت میں ان کی نظمیں احساس، تلاش، کٹھنائی، ناکارگی، ھوالشافی، سلسلہ، آخری ہچکی تلک، خاموشی وغیرہ دیکھی جاسکتی ہیں۔

اتنا پتہ ہے مجھے / اے رب...... / تیرا مقرر کردہ روز / روزِ قیامت...... / جاگنا ہے ......! / اور تیرے آگے / سر بہ سجدہ ہونا ہے مجھے......!!! (احساس)

میں نے تو یہی سمجھا / ہر اک ہچکی پر / تم نے ہی یاد کیا ہے مجھے............! / اور...... / یہ اعتبار / آخری ہچکی تلک / قائم رہے / تو بہتر ہے............!! (آخری ہچکی تلک)

ادب کا ہماری عملی زندگی سے بڑا گہرا اور اٹوٹ رشتہ ہے۔ ادب کی جڑیں زمینی حقائق سے پیوست ہیں۔ اسی لئے ادب کو انسانی جذبات کا ترجمان کہا جاتا ہے۔ کیونکہ یہ انسان کے دل و دماغ کو موجزن کرتا ہے اور ہمارے معاشرے کی سماجی، سیاسی بدکاریوں اور ناہمواریوں کے خلاف آواز اُٹھاتا ہے۔ ادب میں زندگی کا ہر رنگ جلوہ نما ہوتا ہے۔ آج مقامی سطح سے لے کر عالمی سطح تک جو سیاسی سفاکیت، جبر و استحصال، انسانی قدروں کا انحطاط اور تشدد کا ماحول پنپ رہا ہے اگر اس کے خلاف ایک حساس فن کار آواز نہیں اُٹھاتا اور مجرمانہ طور پر خاموشی اختیار کر لیتا ہے تو اس کا تخلیقی عمل مشکوک ہو جاتا ہے ایسے عالم میں اس کی صدائے احتجاج اس کے ضمیر کی آواز بن کر اپنا فریضہ انجام دے سکتی ہے۔ آثر سعید کے یہاں اس کیفیت کو ملاحظہ فرمائیں۔

دہکتے دوزخی صحرا کے ان کسانوں کی / ہتھیلیاں بھی کوئی جا کے دیکھ آئے / بتائے ان کے یہ چولہے کب مسکرائیں گے / پڑھے کوئی تو ان کی کالی ریکھائیں............! (ریکھائیں)

یہ جو میں چُپ کی سزا / کاٹ رہا ہوں / بس دو گھڑی / ان کے آگے / بولنے کا نتیجہ ہے / میری برسوں کی / خاموشی............! (خاموشی)

یہ انساں کے دشمن / یہ خونی درندے / یہ حوا کی بیٹی کے قاتل لٹیرے / جو جنتی ہو ماں ایسے بیٹے / خدا کوکھ اس کی / ابھی بانجھ کردے (گونگی دُعا)

اِن نظموں میں شعور کی بالیدگی، خیال کی ندرت، فکر کی وسعت، جذبہ کی پختگی، احساس کی توانائی کے ساتھ ساتھ فن کی نزاکت اور شعری آہنگ غور طلب ہے۔ علاوہ ازیں اس میں پایا جانے والا تاثر حیرت انگیز ہے۔ یہی جذبہ اور یہی خلوص آثر سعید کو کھلی آنکھوں اور کھلے ذہن کا شاعر کہنے پر آمادہ کرتا ہے۔ دراصل یہی ایک فن کار کی پہچان اور شناخت بھی ہے۔

باہمی اختلاف کے باوجود یہ بات مشترک ہے کہ آرٹ کی روایات، موجودہ انسان کی حسیت اور سوچ کی تہذیب میں ناکام ہو چکی ہیں۔ انسان میں جبلی خود غرضانہ بہیمیت عود کر آئی ہے اس لیے آرٹ کی جمالیاتی بوطیقا کی بنیادیں بھی بدل گئی ہیں۔ وہ دراصل احتجاجی تحریکات ہیں جس میں اعلیٰ اقدار کی پیہم شکست اور عقائد کی تشکیک پوشیدہ ہے۔ جس کی بدولت انسانیت نواز فنکار متاثر ہوتا ہے اور اس کا جواز تلاش کرنے میں جٹ جاتا ہے۔ آثر سعید کی نظمیہ شاعری ان چیزوں کا جواز بھی پیش کرتی ہیں۔

پنڈتوں کی تھالیوں میں ہے رکھا / گنگا جل / ہے پوتر وہ بڑا / ہر منش کی ہے ہتھیلی / اس کی محتاج تر / فیض کی مانند بخشا جائے گا......! / چند لمحوں کے لیے ہی کیوں نہ ہو / اونگتی ریکھاؤں کی تشنہ لبی / پا کے ہوگی بخت ور / روح پائے گی طہارت / چند لمحوں کے لیے ہی کیوں نہ ہو / نہے چلا ہر منش کی (چلا)

آج کے دور کی فضاؤں میں / جھلملاتی روشنی میسّر ہے / پر نئی فکروں کو / آگے بڑھنے کے لیے / اک مکمل روشنی چاہیے......! / اپنے آباء واجداد نے / جو رہ تھی اپنائی / عشق وتصوف کی / اور فلسفیانہ فکر کی روشنیوں سے / آراستہ پیراستہ کیا تھا رستوں کو / لیکن جدیدیت کے علم برداروں نے / گمراہ کر دیا ہے / انسانیت کے رستوں سے / اور اجنبیت کی گھٹن بھر دیا ہے رشتوں

میں/جب تک کہ عشق وتصوف کے/مسائل پہ بات ٹھہری تھی/نہ کوئی ہندو تھا اور نہ ہی مسلمان کوئی/ہر طرف ایک ہی نعرہ تھا/ہم ہیں بھائی بھائی............(نئی فکر......بات پرانی ہے)

اُجلی صبحوں کی/مسرت بھری روشنی/شام کی دھنک کی رعنائیاں/بارشوں کی/سوندھی سوندھی/لال مٹی کی مہک/یہ سب تمہارے نام کرتا ہوں.......!/اور میرے لیے کافی ہے/میں تمہیں چاہتا ہوں/شام کی رعنائیوں میں/رات کی تنہائیوں میں......!(اُجلی صبحوں میں)

آثر سعید معمولی بات کو بھی نظم کا موضوع بنانے کا گر جانتے ہیں۔ان کی نظموں کے موضوعات میں تنوع پایا جاتا ہے۔جن میں اسلامی عقائد بھی عیاں ہیں اور سماج کی پسپائی کا بیان بھی، لحہ لحہ معدوم ہوتی قدروں کا ذکر بھی ہے اور وارداتِ دل بھی، عوام الناس کا درد بھی ہے، عارضی زندگی کے جفا و جبر کی داستان بھی، اس کے اقدار کش تہذیبوں کا ذکر بھی ہے اور اس کا کرب بھی، حسن پرستی کی تصویر بھی ہے اور لذّتِ وصل کی تمنا سے آشنا بھی۔جو اِن کے ذہن کی تجسس پسندی، ڈرامائیت نگاری، تنوع پسندی اور نفسیاتی ژرف نگاہی کی شاہد ہیں۔مثال کے طور پر اس مجموعہ میں شامل ان کی نظمیں تمہارے نام، ناکارگی، مُکتی، کوششِ ناتمام وغیرہ دیکھی جا سکتی ہیں۔جہاں شاعر کی ایک آنکھ باہر کے مناظر سمیٹتی ہے تو دوسری طرف اندر کے مناظر کو بھی جذب کرتی ہے گویا یہ ایک کھڑکی ہے جو اُفق کے اُس پار بھی کھلتی ہے۔آثر سعید کی شاعری میں مفاہیم، سر بلندی اور بیانیہ جو خود میں اس قدر محیط و سایہ فشاں ہوتے ہیں کہ ان کے سامنے قواعد و ضوابط اور زبان کی کمیاں نہیں ٹھہر پاتی ہیں۔

دور حاضر میں ایسے فن کاروں کی کمی نہیں ہے جو عزت و شہرت، نام و نمود کے ساتھ ساتھ انعامات، خطابات اور اعزازات کی خاطر کئی حربے استعمال کرتے ہیں، شارٹ کٹس یا بیاک ڈور اینٹری مارتے ہیں یا پھر کسی گاڈ فادر کے ذریعہ اونچی چھلانگ لگاتے ہیں اور ادبی اُفق پر درخشندہ ستارہ نہیں بلکہ آفتاب بننے کی کوشش کرتے ہیں مگر ایسے بھی فن کار موجود ہیں جو خاموشی کے ساتھ

فن سے جڑے ہوئے ہیں انہیں صلہ کی تمنا ہے اور نہ ہی ستائش کی پرواہ۔ جو فنکار اپنے ماحول، علمی و تخلیقی صلاحیت، تربیت، مطالعے، جذبات واحساسات، تجرباتِ زندگی اور حالات ومحرکات سے ادبی اُفق پر اُبھرتا ہے، اپنے ذوق وشوق اور ریاضت کی بدولت اپنے کلام کو معنویت اور اثر انگیزی عطا کرتا ہے اور اپنی فطری استعداد کے مطابق مقبولیت اور شہرت کے مدارج طے کرتے ہوئے ایسے مقام پر پہنچتا ہے جہاں کھڑے ہو کر دور سے پہچانا جا سکے۔ دراصل ایسے ہی فنکار ادب میں ہمیشہ زندہ رہتے ہیں۔ آثر سعید بھی ان میں سے ایک ہیں جن کی زندگی اور اس کا کرب نظم کے روپ میں ڈھل کر زندہ رہنے والی شاعری کا روپ عطا کرتا ہے۔

فن کار کا کام فن پارے تخلیق کرنا ہوتا ہے ان میں شہکار کونسا ہے رطب و یابس کی تعداد کیا ہے اس کا احتساب آنے والی نسلیں کرتی ہیں اور سچ تو یہ ہے کہ وقت سب سے بڑا محتسب ہے۔ ہر عہد اپنے ساتھ کئی سوالات لاتا ہے جن کے جوابات آنے والے وقت میں دیئے جاتے ہیں اور یہ ایک تسلسل ہے جو ازل سے چلا آ رہا ہے۔ آثر سعید کے فن کا احتساب بھی آنے والا وقت اور آنے والی نسلیں کریں گی بشرطیکہ دور حاضر کے کوتاہ ذہن اور تنگ نظر ناقدین اسے وقت اور حالات کی چکّی میں پیسنے کے بجائے اس کا صحیح محاسبہ کریں اور اس کی شاعرانہ عظمت نہ سہی مگر اس کی شاعرانہ کیفیت اور حقیقت کو سمجھیں۔

یادوں کے نقوش

از : مشتاق سعید، میسور

مصنف: پرچھائیاں، تنہائیاں (افسانوی مجموعے)

e-mail : mushtaqsayeed05@gmail.com

مجھے اعتراف ہے کہ میں آثر سعید صاحب کو اُن دنوں سے جانتا ہوں جب میں نے افسانہ نگاری کے میدان میں ابھی ڈھنگ سے قدم جمائے نہیں تھے۔ ان کے لکھے افسانے اور منظوم کلام نظر سے گذرتا رہا۔ ان سے ملنے کا اشتیاق بڑھتا رہا۔ لینڈ لائین تو بہت پرانی ایجاد ہے۔ موبائیل فون نے قدم جمانے شروع کردیئے تھے۔ تاہم اُن دنوں میرے پاس نہ موبائیل فون تھا اور نہ ہی لینڈ لائین فون ۔ مجھے فون رکھنے کی ضرورت اس لئے محسوس نہ ہوئی کہ یہ ساری سہولت مجھے بی ای یل کارخانہ میں مفت موجود تھی۔ اُن دنوں لینڈ لائن کال کافی مہنگے تھے۔ کون اس کے وزنی بل پاکٹ سے لگائے؟ ان کی ادبی کاوشیں پڑھ کر ان سے ملاقات کرنے کا شوق بڑھتا ہی رہا اور یہ ملاقاتیں صرف بنگلور ہی میں ہوسکتی تھیں ۔ اس لئے کہ بنگلور ایک اہم ادبی مرکز ہے۔ جہاں پر مشاعروں کے ساتھ ادبی محفلیں اور ادبی مقابلے بھی منعقد ہوا کرتے ہیں۔

۱۹۹۵ء کی بات ہے کہ بنگلور کی الصدا نامی ایک مشہور بزم نے کُل ریاستی افسانہ نویسی کا مقابلہ منعقد کیا۔ اتفاقاً ہم دونوں نے بھی اس میں حصہ لیا۔ میں نے گوشۂ ممتاز شیریں میں اوّل انعام اور آثر سعید نے گوشۂ خلیل خاور میں پہلا انعام حاصل کیا۔ وہاں ہم دونوں کی پہلی ملاقات ہوئی۔ سعید ہونے کی سعادت کے سبب دونوں کی دوستی بڑھتی رہی۔

اس کے بعد اخبار میں اعلان شائع ہوا کہ انسٹی ٹیوٹ آف اگری کلچر، کوئنس روڈ ، بنگلور میں آثر سعید کو ان کے ادبی خدمات پر اعزاز دیا جانے والا ہے۔ اس موقع کو غنیمت جان کر میں

وہاں جا پہنچا۔ وہاں کئی مشہور ادیبوں کے ملنے کی مجھے توقع تھی ۔ اب یہ بھی بتادوں کہ میں اتنا معروف ادیب نہیں تھا کہ ادبی برادری مجھے دیکھتے ہی مصافحہ کرنے کے لئے آگے بڑھے اور گلے سے لگا لے۔ فلمی مضامین لکھ کر میں نے شہرت ضرور پالی تھی۔ لیکن فلمی مضامین، ادیبوں سے کہاں یاری کراتی ہے؟ لے دے کر مرحوم فرحت کمال، ضیاء جعفر، انیس ابراہیم جیسے چند ہی قدردان میری جھولی میں آگرے تھے۔ محمود خان قیصر کی فلمی قابلیت کا راز صرف مجھ تک ہی محدود رہا تھا۔ مجھے آثر سعید کو اس اعزازی نشست میں پہچاننا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ اس مجلس میں فرحت کمال، آثر سعید اور میں بہت دیر تک بیٹھے محو گفتگو رہے۔ فرحت کمال کو بھی اُس نشست میں اعزاز دیا گیا۔ مجلس کے بعد بھی ہم تینوں بہت دیر تک یکجا رہے۔ اس ملاقات میں آثر سعید کی شخصیت نے مجھے کافی متاثر کر دیا۔ پھر میں پُراثر سعید کے نام سے انہیں یاد کرنے لگا۔

میں اپنا دائرہ بھی وسیع کرنے لگا تھا۔ گاہے ماہے ہماری ملاقات ادبی محفلوں میں ہوتی رہی۔ دوستی بڑھتی گئی۔ ایک مرتبہ میں کسی محفل میں شرکت کی خاطر میسور آیا۔ پروگرام رات دیر گئے تک چلتا رہا۔ میں پریشان کہ رات کیسے کٹے۔ کس کے ہاں رات بسر کروں۔ حالانکہ میرے درجنوں رشتہ دار میسور میں تھے۔ لیکن دیر گئے کسی کے گھر دستک دینا میری عادت کے خلاف ہے۔ ایسے میں آثر سعید نے میری پریشانی کو بھانپ لیا اور اپنے دولت کدہ پر قیام کرنے کی گذارش کی۔ گوشہ پردہ کے درمیان شب گذارنے کی دعوت دینا دِل گردہ کی بات ہوتی ہے۔ ایسی مہمان نوازی میں نے بہت کم ادیبوں میں پائی۔ ان کی شخصیت نے مجھے کافی متاثر کیا۔ خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ حادثات اور اتفاقات نے مجھے بنگلور سے میسور ہجرت کرنے پر مجبور کر دیا۔ آسودہ زندگی گذانے والے کے تنگ حالی کے دن آگئے۔ ماضی میں جس کی جیب نوٹوں سے بھری ہوتی تھی وہ پیسے پیسے کا محتاج ہوگیا۔ اُسے گذر معاش کے لئے ہاتھ پاؤں مارنے پڑے، وہ بھی ریٹائرمنٹ کے بعد، کیا کیا سنہرے خواب دیکھے تھے میں نے، کھانے کے لالے پڑ گئے۔ آج بھی سوچتا ہوں تو کلیجہ منھ کو آتا ہے۔ ایسے تنگ حالی کے دِنوں میرے اپنے اجنبی بن گئے تھے۔ مجھ سے آنکھ چُرانے

لگے تھے۔ میرے سکھ چین کے ساتھ سب کچھ چھین لیا تھا۔ خودداری کی انتہا یہ رہی کہ انتہائی تنگی کے باوجود میں نے کسی سے مدد نہیں طلب کی۔ کسی کو اشارۃً بھی نہیں بتایا کہ میں انتہائی کسم پرسی کے عالم میں ہوں۔ پیٹ کی آگ بجھانے کی خاطر میں نے ڈی ٹی پی کو پیشہ بنایا۔ میں نے ہاتھوں کو بیچ دیا لیکن ضمیر کو بیچنا گوارہ نہیں کیا۔ لیکن پہچاننے والوں نے تاڑ لیا۔ مجھے میسور میں سہارا دینے والے دو چار احباب میں آثر سعید پیش پیش رہے۔

اتفاقاً مجھے آثر سعید کے دولت کدہ سے قریب ہی اپنا غریب خانہ آباد کرنا پڑا۔ اب ہر صبح میں ان کے دولت کدہ جا پہنچتا۔ کچھ عرصہ قبل میں نے چیلنج لے کر ڈی ٹی پی کرنا سیکھ لیا تھا۔ اُن دنوں مجھے آثر سعید کی ایک کتاب ''زرّیں...... یادوں کے نقوش'' کی ڈی ٹی پی شوقیہ کرنی پڑی تھی۔ اُس کتاب کو شائع ہوئے عرصہ گذر چکا تھا۔ اب مجھے موقع ہاتھ لگا۔ ڈی ٹی پی میں اُن کا ساتھ دینے کا وعدہ کرتے ہوئے میں ان کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ گیا کہ وہ اپنا منظوم کلام یکجا کریں اور کتابی شکل دیں۔ انہوں نے پہلے پہل ٹال مٹول سے کام لیا۔ لیکن میری سنجیدگی کو دیکھتے ہوئے انہوں نے اپنے منظوم کلام کو میرے حوالے کر دیا۔

ہماری دوستی کے دوران آثر سعید کے بے شمار افسانے، غزلیں اور نظمیں نظر سے گذرتی رہیں۔ لیکن ایک انوکھا فن میں نے ایسا دیکھا جو دوسرے شعرا میں کم پایا جاتا ہے۔ روز نامہ پاسبان کی ملازمت کے دوران مشہور صحافی راز امتیاز صاحب نے ان کی اس خصوصیت کی جانب توجہ مبذول کروائی تھی۔ وہ خصوصیت تھی ان کی آزاد شاعری، انہوں نے مجھے بتایا تھا کہ آثر سعید میں آزاد شاعری کا جوہر اونچے درجے کا ہے۔ مرحوم راز امتیاز صاحب کی رائے حرفِ آخر کا درجہ رکھتی ہے۔ جب میں آثر سعید کے گھر آنے جانے لگا تو انہیں اپنا منظوم کلام دکھانے کی استدعا کی۔ میں ان کے کلام میں افسانوی اختتام دیکھ کر چونک اٹھا۔ یہ ایک ایسا انوکھا فن تھا جس نے مجھے کافی متاثر کر دیا۔ ان کی سیکڑوں نظموں میں سے میں نے تقریباً 85 نظموں کا انتخاب کیا اور آپ کے فن شناس مطالعہ کی نذر کر دیا۔ اب نتیجہ آپ کے سامنے ہے۔

اثیرِ اثرِ سعید

سرقاضی سید قمرالدین قمر

سینئر آفیسر گراسم انڈسٹریز

115/A بیت الامین امام محلہ ہری ہر۔ 577601

سیل:09980388495

e mail : syed.qamruddin@adityabirla.com

تاریخ کا مطالعہ بتاتا ہے کہ ترقی کے پائیدان ہمیشہ علم سے وابستہ رہے ہیں۔قومِ مسلم تمام قوموں کی امامت کے منصب پر قائم تھی لیکن رفتہ رفتہ ہمارے درمیان سے علم اٹھتا گیا جس کے نتیجہ میں امامت بھی جاتی رہی۔آج حال یہ ہے کہ ہم اپنے تعلیمی میعار کی گراوٹ کے بارے میں فکر و تردد میں لگے ہیں۔میعارِ تعلیم کو بلندیوں پر لے جانے کی ترکیبیں سوچتے رہتے ہیں۔مدرسوں میں اساتذہ حتی المقدور کوششوں میں جٹے ہوئے ہیں کہ کس طرح تعلیم کی ترقی کی جائے۔قوم کے پیشواء اور علمائے کرام اپنے اپنے طور پر تعلیم کی طرف اپنی توجہ مرکوز کرنے میں دن رات ایک کررہے ہیں۔

تعلیم کا مفہوم صرف لکھنا پڑھنا اور سیکھنا ہی نہیں بلکہ اس مفہوم میں درس و تدریس کے ساتھ ساتھ تدریب یعنی فنون میں مہارت پیدا کرنا، تادیب یعنی ادب سیکھنا اور تربیت یعنی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کی ہم آہنگ نشو ونما کرنا ہے۔اس فلسفہ کو صرف ایک شاعر یا ادیب ہی سمجھ سکتا ہے۔وہی میعارِ ادب کو ترقی کی نئی منزلوں تک پہنچا سکتا ہے۔وہ اپنے عام فہم اسلوب، منفرد لہجہ، اپنی تخلیقات میں رچا ہوا

سوز و گداز، تاثر، خوش بیانی، تراکیب کی نیرنگیاں، جدت مضمون طرازی، رنگیں بیانی اور سہلِ ممتنع کی پاکیز گی سے اپنی تخلیقات (خواہ شعری ہو یا نثری) میں نرم و گداز تجربات کو بڑے ہی خلوص اور سادگی سے بیان کرتا ہے۔ ایسے ہی فنکاروں میں آثر سعید بھی ایک ہیں۔

زیرِ نظر مجموعہ کو دیکھ کر کہا جا سکتا ہے کہ اس میں مشمول نظموں میں سے چند ایسی نظمیں پائی جاتی ہیں جو اظہار ذات کی شائستگی اور صداقتِ آپ بیتی کو جگ بیتی میں تبدیل کر دیتی ہیں۔ اس کتاب میں طویل نظمیں جہاں تجربہ و آگہی اور خارجی اثرات و عوامل کی بیانیہ بن جاتی ہیں وہیں مختصر نظمیں شاعر کے داخلی تجربات و وارداتِ زیست کی غماز ہوتی ہیں۔

آثر سعید کی نظموں میں، جو سادگی پائی جاتی ہے اس کے پیشِ نظر یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ فنکار کی کہی ہوئی بات اور اس کے مشاہدات لفظ بہ لفظ آج کی نئی نسل کی آگہی میں اضافہ کرنے میں ممد و معاون ثابت ہو سکتے ہیں جسے ٹرانسفر آف نالج کہا جاتا ہے۔ بس اسی طرح چراغ سے چراغ روشن ہوتے جاتے ہیں۔ پھر زبان و ادب کو اپنی چکا چوند روشنی سے منور کر دیتی ہیں۔

آثر سعید کی نثری نظمیں سازِ باطن کے تاروں کو ہولے ہولے مرتعش کرتی ہیں۔ ان کی نظموں میں بھرپور شعریت موجود ہے۔ جن میں آثر سعید نے اپنے خیالات و جذبات کو بڑی خوبی سے کمیونیکیٹ کیا ہے۔ آپ کی نثری شاعری سے قاری پر وہی امپیکٹ ہوتا ہے جو غزلوں اور پابند نظموں سے ہوتا ہے اور قاری بآسانی شاعر کی روح میں جھانک لیتا ہے۔

آثر سعید اپنی آزاد نظموں کو مظہر فطرت کے مختلف خارجی روپ، داخلی معنویت سے ہم آہنگ کر کے شعری پیکر میں ڈھال دیتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ انسان کو اپنے اندر ڈوب کر سراغِ زندگی پانے کی دعوت بھی دیتے ہیں۔ اسی لئے یہ نظمیں حقیقت نگاری، فکری اور متصوفانہ زاویوں کا بڑی سادگی اور صداقت سے احاطہ کرتی ہیں اور ان کی بدولت عبودیت و روحانیت کی بیکراں لہریں زیرِ سطح رواں ہوتی ہیں۔

آثر سعید کی نظمیں دھیمے لہجہ کے پیرہن میں لپٹی ہوئی ہونے کے باوجود سماج میں پنپنے والے

گوں ناگوں مسائل کے شوروغل کی عکاسی کرتی ہیں۔ ان نظموں میں تلخ حقیقت کا ایک کائناتی وجود سامنے آتا ہے جو آگہی اور اضطرابی کیفیت کے مماثل ہے۔ یہی وہ انجذابیت ہے جو فنکار کو ممتاز بنا دیتی ہے۔

آثر سعید اردو زبان وادب کے مزاج سے صرف آشنا ہی نہیں بلکہ اس کے تفاعل سے پورے طور پر آگہی رکھتے ہیں۔ اس لئے آپ کی نظمیں نہایت سلیس اور فصیح و بلیغ ہونے کے ساتھ ساتھ قاری کے ذوقِ جمال اور شستہ مذاق کی آئینہ دار ہیں۔

شکر گذار

رب العزت کا احسانِ عظیم ہے کہ اس نے مجھے فکر وفن کی دولت عطا فرمائی اور توفیق عنایت کی کہ اپنے محسوسات کے اظہار کے لیے آزاد نظم کے فن کو وسیلہ بناؤں۔

ڈاکٹر بی محمد داؤد محسن پرنسپال مِلت پری یونیورسٹی کالج داونگرے اپنے ایک مضمون میں رقم طراز ہیں ......

''کوئی بھی فن کیوں نہ ہو ریاض چاہتا ہے۔ اس کے علاوہ جب تک فن کار کو اس کے فنی تقاضوں کا علم نہ ہو فن پارہ تخلیق نہیں کرسکتا۔ اگر کر بھی دیا گیا تو وہ فن کی کسوٹی پر پورا نہیں اُتر سکتا......''

اِس بات کو کسوٹی بناتے ہوئے میں نے اپنی بساط بھر ریاضت سے اُن خیالات کو یکجا کرنے کی کوشش کی ہے جو میرے شعور کے سمندر میں موجزن تھے۔ مگر اس بار میں نے اپنے جذبات کے اظہار کے لئے آزاد نظم کا آنچل تھاما ہے۔ آنچل کیا ہے سماج کے نشیب وفراز!۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ میرے آنسو، اُس آنچل میں موتی بنیں گے یا جذب ہو کر اپنا وجود فنا کر بیٹھیں گے یا آنچل سے ڈھلک کر قدموں کی دُھول تلے روندھے جائیں گے۔

انہیں خیالات کی آوارہ گردی کو ''قبائے زرّیں'' کہہ کر قرطاس کی توسط سے قارئین کے ذہنوں تک لانے کی ایک ہلکی سی کوشش کیا ہوں۔

مجھے اُمید ہے کہ ذکی الحس قاری نظموں کی معنویت پر غور کرے گا۔ مفہوم کو اپنی دانست کی دہلیز سے محاسن ومعیوب پر نظر ڈالتے ہوئے شاعر کی حوصلہ افزائی کرے گا۔ تاکہ وہ ادب کے میدان میں نئی نئی راہیں تلاش کر سکے۔

کرناٹک اُردو اکادمی کا میں احسان مند ہوں کہ میری پہلی کوشش ''مسافتِ

ہجراں'' افسانوں کا مجموعہ کی اشاعت کے لیے مالی اعانت فرمائی تھی۔ بعد غزلوں کا مجموعہ'' اوراقِ زرّیں''، پھر افسانوی مجموعہ'' زرّیں...... یادوں کے نقوش'' کو بھی مالی اعانت فرمائی تھی۔

میں اپنے کرم فرما دوستوں کا شکر گذار ہوں کہ انہوں نے مجھے خلوص و محبت کی دولت بخشی، خاص کر ڈاکٹر بی محمد داؤد محسن کا جنہوں نے'' پیش لفظ'' لکھ کر میری اس کتاب کو مطالعہ کے قابل بنایا۔

جناب مشتاق سعید کا اگر شکریہ نہ ادا کروں تو میرے خلوص پر اُنگلی اُٹھے گی۔ میں اُن کا بھی تہہ دِل سے ممنون ہوں جنہوں نے ڈی ٹی پی کی سخت ذہنی محنت میں مجھے برداشت کیا اور یادوں کے نقوش کے ذریعہ ماضی کی سیر کروائی۔

سر قاضی سید قمر الدین قمرؔ صاحب کا بھی بے حد سپاس گذار ہوں کہ انہوں نے بہت ہی کم وقت میں میری نظموں کا جائزہ لیا اور اپنے خیالات کو قلمبند کیا۔

خیالات کا تانا بانا بُننے میں میرا سماج برابر میرے قدم سے قدم مِلاتا رہا۔ ویسے بھی ان نظموں میں شیرینی کم اور تلخی زیادہ ہے۔ انہی تلخ تجربوں کا ایک مکمل اظہار ہے'' قبائے زرّیں''۔

آثر سعید

میسور

حمدِ باری تعالیٰ

خدا..........................!

تُو ہی سب کچھ ہے

میں کچھ بھی نہیں...............!

صرف............!

مٹّی سے بنا

انسان ہوں...................!!

بالکل حقیر

جس کو تُو نے شرف بخشا

اشرف المخلوقات کا

حُکم سے تیرے ہوئے

میرے آگے

سب ملائک سجدہ ریز"

اک بجز ابلیس کے
مجھ کو دی تُو نے خلافت
اس زمیں کی
اور..........
ابلیس کو دائم حیات
وہ کہ جس نے پیروں تلے
شر کے جال پھیلائے
میں پناہ مانگا
شیطانی وسوسوں سے
شُکر ہے تیرا
دی پناہ تُو نے مجھے

☆☆☆

نعتِ رسول ﷺ

وَاَطِیعوا الرّسُولَ ۴/۵۹

اور............

اطاعت کر رسولؐ کی
حکم ہے تیرا مرے اللہ
جب کہ تُو خود بیان کرتا ہے
پاکی رسول کی
میں کہاں سے لاؤں طاقت
میری لاغر زباں
کیا کرے پاکی بیاں
ہے نحیف اِتنا بدن
کیا کرے
طاعت رسولؐ کی
تُو تو حاکم ہے خدایا
حکم تیرا بجالاؤں گا ضرور
ورنہ کہلاؤں،

راندۂ درگاہ..........!

ہے مرا دامن گناہوں سے بھرا

اور تری نظرِ کرم

انتہا شفاعت کی

بس یہی امید ہے..........!!

یارب میرے رسولؐ کو

کیسی فضیلت بخش دی

حکم دے دیا کیسا

اللہ مرے

تحقیق جس نے کی اطاعت

رسولؐ کی

وہ اطاعت کر چکا

اللہ کی

مَن يُطِعِ الرَّسُولَ

فَقَد اَطَاعَ اللّٰه ٤/٨٠

☆☆☆

دُعا

شبِ قدر کی
بابرکت رات کا واسطہ دے کر
پھینک کر چھپائے ہوئے خنجروں کو
آستینوں سے
گناہوں میں ملوث
ہاتھوں کو اُٹھائے
دُعا کریں............
اے خدا............!
رحم کرنے والے مہرباں
پناہ دے
اُس دیمک سے ہم کو
جو کہ قبروں میں
سوکھی ہڈیوں کو چاٹ جائے گی

اے نہایت رحم کرنے والے مہرباں

مالک ہے روزِ جزا کا تُو

اس شب کی بابرکت

رات کا واسطہ لے کر

ہم کو سیدھا راستہ لے چل

اُن کا

جن پر فضل ہے تیرا

☆☆☆

عالمِ اسلام کے مفکرِ اعظم
حضرت مولانا سید ابوالحسن علیؒ

عالمِ انسانیت کا اک روشن چراغ
بروزِ جمعہ
۳۱ر دسمبر ۱۹۹۹ء کو
بجھ گیا..........!
جو تھا.....
جانِ تہذیب پیامِ انسانیت
شریعت، طریقت، معرفت اور حقیقت
کا امیں
جس کی سانسوں کا چراغ
ظاہراً تو گُل ہوا ہے.....مگر
اس کے قدموں کے نقوش
آج بھی روشن چراغ
بن کے جلے ہیں..........!!
کتنے سینوں میں
فہم وادراک کا اُجالا پھیلا چکے ہیں
نسل در نسل جن سے
روشن ہوتے رہیں گے
بن کر چراغ..........!!!

☆☆☆

احساس

اتنا پتہ ہے مجھے

اے رب..........!

تیرا مقرّر کردہ روز

......روزِ قیامت......

جاگنا ہے..........!

اور تیرے آگے

سر بہ سجدہ ہونا ہے مجھے......!!!

☆☆☆

نکتہ بیں......خلیل خاور

(مصنّف: مسافتِ ناتمام)

وہ سُخن کا رازدار و نکتہ بیں
ہیں ادب کے گلستاں میں
جس کے قدموں کے نقوش
جو چلا تھا زندگی سے موت تک
اِک نرالے ڈھنگ سے
اپنی سانسوں کا سفر
نہ پڑا جس پر بدلتے وقت کا کوئی اثر
جس کی آنکھوں سے عیاں
صدیوں کے گہرے کرب کا پورا حساب
اپنی آہوں پر چڑھائے
مسکراہٹ کا سرور
ایک شاعر و افسانہ نویس
صاحبِ طرز و بیاں
ایک چادر تان کر
آج ہے خاموش کیوں.............؟

☆☆☆

آہ......! ذکی انور

کتنی آنکھیں
کتنے چہرے
رقص کرتے
دوڑتے
اَن گنت سائے چلے
ہاتھ میں خنجر لیے
ایک سچائی کی خاطر
ڈٹ گیا تھا آسماں
جبر کی آندھی چلی
بجھ گئی وہ مشعلِ رہ
وقت کے انساں نمایہ بھیڑئے
ان کی سفاکی پہ نالاں
خون آلودہ فضا
وقت کی تاریخ کے اوراق بھی
خون کی لالی سے رنگیں ہو گئے
اور پھر......
بے ضبط ہو کر
گر پڑا ہے......
اندھے کنویں میں
آسماں......!

☆☆☆

مَن کا جوگی

شعورِ زیست کی خاطر
خودی کی آن کی خاطر
''مَن عَرفَ'' کے لئے
ترک کردوں دنیا داری کو
اور صوفی، سنت بن جاؤں
یا تو............
گیرو، ہرے، سیاہ، اُجلے
پہن کر کپڑے
جوگی یا پیر بن جاؤں
پر ذرا سوچوں......
اُتر جائے اگر تن سے میرے گدڑی
تو کچھ نہ رہ پاؤں
تو......
پھر کیوں نہ میں
ترک کردوں من سے دنیا کو
اور......
مَن کا جوگی کہلاؤں

☆☆☆

برگد کا پیڑ

میرے سائے میں

ہر کوئی ستالے

دن کی سُلگتی دُھوپ میں

اور......

رات میں

مجھ میں آسیب بستے ہیں

میں ہوں بوڑھے برگد کی مثال

☆☆☆

یادیں

پرندے
بے سمتوں کے سفر سے
شام ڈھلتے ہی
تری چھت پہ آ بیٹھے
اونگھتے رہتے ہیں
(جاڑوں کے موسم ہوں
یا لو اُگلی راتیں ہوں)
کبھی کبھی
سیدھے تری چھت سے
(تری چھت جن کا گھونسلہ ہے)

پھدک پھدک آتے ہیں
کالے بھیگے ڈیروں میں
رات بھر گھومتے رہتے ہیں
(کسی آوارہ بادل کی طرح
گلی کوچوں میں پھرتے
یا کسی پاگل کی طرح)
جا بجا چونچ مارے
ڈیروں کے کالی غلافوں کی
دھجیاں اُڑاتے ہیں
اور تا دمِ صبح
بیٹ چھوڑے
اُڑ جاتے ہیں

☆☆☆

قُربت

میرے پہلو میں اب بھی زندہ ہے
اس کے سینے کی مخملی گرمی
میری بانہوں میں کل جو جھولا تھا
ایسا نازک وہ چاندنی سا بدن
آج سونے کے اور چاندنی کے
تخت پہ ایسے جم کے بیٹھا ہے
جیسے دنیا ہی مِل گئی اُس کو......!

جسم کیا ہے وہ ایک دھوکہ ہے
اک چھلاوا ہے اک تماشہ ہے
چند لمحوں کی قربتوں کے لیے
میں گراں قدر شئے کو بیچوں کیوں
روح سے بڑھ گئیں ہیں کافی ہیں
جسم سے قربتیں بڑھاؤں کیوں......!!

☆☆☆

تمہارے نام

اے میرے عزیزو
مجھ کو یاد کر لینا
میں تمہارا
ماضی، حال اور مستقبل
بن کر جیا ہوں......!
میں اس صدی کا
مورخ بن کر جیا ہوں......!!
واضح کر دیا میں نے
ہر ایک ورق کو تم پر
میرے اندر
اَن گنت تاریخیں دفن ہیں
مجھے دفن کرنے سے پیشتر
اچھی طرح
یاد کر لینا
میری موت بے وقت بھی
واقع ہو سکتی ہے

☆☆☆

تلاش

میرا مقدر

تلاش......

مارکو پولو

واسکوڈی گاما

یا......

کولمبس کی طرح

میں بھی آثر سعید

تلاشتا رہتا ہوں

لفظ و معنی

فکر کے جزیروں کو

☆☆☆

کٹھنائی

میں جو چاہوں بن جاؤں

بن سکتا ہوں......

میرؔ، کبیرؔ، نظیرؔ و انشاءؔ

مومنؔ، سوداؔ، غالبؔ بھی

میرے بس میں ہے، بن جانا......!!

پر میرے لیے

بہت کٹھن ہے

آثرؔ سعید بن جانا......!!!

☆☆☆

تم نہ ملو مجھ سے............!

یہ تمہاری چاہتوں کا سفر ہے
تم جو مِل جاؤ تو ختم ہو
یہ میرے خیالوں کا سفر ہے
تم جو مِل جاؤ تو
فکر کے سوتے سوکھ بھی سکتے ہیں
یہی بہتر ہے
تم نہ ملو مجھ سے
مجھ کو کرنے دو
تنہا سفر
تم چاند نگر کی رانی بن کر
میری آنکھوں سے میلوں دور
چمکتی رہو،
دمکتی رہو،
تمہیں پانے کی کوشش میں
فکر وفن کے نئے جزیروں کو
ہر روز
جنم دیتا رہوں

☆☆☆

ناکارگی

لاکھ ہنر مند سہی

اپنے لمحوں کو مصرف رکھنے میں

جب کبھی

وہ ایک لمحہ آتا ہے

لاکھ جتن کے باوجود

کاٹے نہیں کٹتا

مجبوریوں کی انتہا یہ ہے

خود کو ناکارہ سا محسوس کرتا ہوں

☆☆☆

ھُوالشّافی

جوکوئی حلق سے اُتار لے
شِفا بن جائے اُس کے
واسطے
وہ ہے
کڑوے
نیم کے پتوں میں بھی
شفا دینے والا

☆☆☆

ہو مبارک تجھے یہ تہذیبیں

رگوں سے کس کی یہ بہتا ہے ناحق خون
جو کہ احساس کی شہ رگ پہ برابر ٹپکے
حلق سے کس کی نکلتی ہیں بھیانک چیخیں
جو سماعت کی دھجیاں کر دے
غور سے دیکھا تو یہ ہوا معلوم
میرے بھائی کا خون تھا جس کو
خنجروں سے بہا دیا کوئی
یہ میری ہی بہن کی چیخیں تھیں
جس کو بے آبرو کیا درندوں نے......!
کس کی چھت سے نکل رہی ہیں یہ لپٹیں......؟
جل رہا ہے دکان یہ کس کا......؟
چھوڑ رہا ہے فلک کو جا کے دھواں
آسماں بن گیا ہے سوکھا کنواں
بوند دو بوند بھی نہیں پانی......!

جل گیا تہذیب وتمدن کا لباس
اپنے کاندھوں پہ لئے شکستہ لاش
سوچ میں گُم یوں بیٹھا ہوں
جیسے پتھر کا ہو گیا ہوں میں......!
بال داڑھی کے جل گئے تو نہیں؟
قبریں ولیوں کی مِٹ گئیں تو کیا
لُٹ گئیں عصمتیں تو کیا پرواہ
گھس گئے مسجدوں میں سوروں کے دَل
پھاڑ ڈالا گیا قرآنِ مجید......!
میں نہیں جانتا اس طاقت کو
جن کا شیوہ ہے جبر واستحصال
تُو مگر جانتا ہے سب باتیں
دے انھیں توفیق وگرنہ پھر
لوٹ جاؤں گا یہیں سے پھر
پھر اُسی کالی دنیا کو

چھوڑ آیا تھا صدیوں پہلے جسے
خون ہی خون تھا ہر اک منظر
ہاتھ خونی تھے دِل بھی خونی تھا
ذہن خونی تھا روح خونی تھی
گر ہے تہذیب وانسانیت کی یہ منزل......؟
میں بھی خونی ہوں
جب کہ وہ بھی خونی ہے......!
میں بھی خونی ہوں
جب کہ تو بھی خونی ہے......!
ہو مبارک تجھے تمدّن یہ
اور انسانیت کی لاشیں بھی
ہو مبارک تجھے یہ تہذیبیں......!!!

☆☆☆

قَسَم لے لو مرے محمدؐ کی

اپنے اَسلاف کی وہ تلواریں
آبدار اور خم تھی کھائی ہوئیں
دھار ایسی کہ سنگ ٹوٹے تھے
جذبۂ حق تھا
جنگ جیتے تھے
لے امانت میں بھول جاؤں گا
اس حماقت پہ پھول جاؤں گا
تھا نہیں یہ گماں مجھے ہرگز
ورنہ رکھتا نہ تھا وہ تلواریں
آبدار اور خم تھی کھائی ہوئیں
اپنی غفلت نے زنگ لگایا ہے
کھونٹیوں پہ انھیں چڑھایا ہے
آج سوچا ہوں پھر بڑھاؤں ہاتھ
پھر سے صیقل میں دوں شجاعت کی
قسم لے لو مرے محمدؐ کی

☆☆☆

شہکار

کیا حسین و جمیل لگتی ہو
تم کو دیکھوں تو دیکھتی جاؤں
آنکھیں ایسی کہ جھیل ہو کوئی
ڈوبنے والا نہ عمر بھر اُبھرے
ناک ستواں ہے جیسے تیر کوئی
ہونٹ ایسے کہ پھول کھلا ہو ابھی
کیا کہوں تیرے گال کی سُرخی
آسماں پر شفق ہے چھوڑی ہوئی
زلف کھُل جائے تو لگے ایسے
رات جیسے ہوئی ہے ابھی......!
کس کو فرصت نصیب ہو جائے
دیکھے قدرت کا یہ حسیں شہکار
دیکھتی ہوں،
میں آہ بھرتی ہوں
آئینے سے یہ باتیں کرتی ہوں!

☆☆☆

عجیب خاموشی

کیا ہوئیں
خوش گوار زندگی کی صالح تہذیبیں......؟
پاکیزہ معاشرے کی استواریاں......؟
خود ہی تھامے تھے بڑھ کے ہاتھوں میں
قوم و مِلت کی بہبودی کی ڈور
ہانکتے خوش گوار منزلوں کی اور
پر نکل آئے کس طرف سارے
چکرویہا میں پھنس گئے سارے......!

یہ تو اپنی صلاحیت پہ تھا مبنی
چھوڑ کر اختلافِ رائے سب
طریق اور عقائد کو یک جا کر کے
کرتے سمجھوتہ نظریاتی جنگوں کا
اور نہ جنگ
معاہدے پہ دستخط کرتے......!!

برعوض اس کے آج یہ کیا ہے
چپہ چپہ بنا ہے اک مقتل
ذرّہ ذرّہ کی آنکھ میں ہے خوں اُترا
نوجواں نسل ہے پریشاں سی
دیکھ کر نفرتوں کے داغوں کو
کیا یہی آباءواجداد کے خواب کی تعبیر
دیں جواب دانش وبینش اب
تشنۂ تکمیل کیوں ہوئے ہیں ہم......؟
دِل ہوئے ہیں ہمارے گھائل کیوں......؟
کیوں ہوئے مغموم اور پریشاں ہم......؟
کوئی غم خوار و مدد گار نہیں
ہر طرف تن گئی ہے انتشار کی چادر
ہر نفس بس یہی تو پوچھے ہے
کون ہے زندگی کا حامی اب
کون محسوس کرے گا سوزِ نہاں......؟
نوجواں نسل منتظر ہے ابھی
کون دے گا جواب آ کے انھیں
ہر طرف ہے عجیب خاموشی............!!!

☆☆☆

مکتی

آج بھی سحر کی شعاؤں میں
اتنی گرمی نہیں تھی دوستو
حیات کی ان کچی ڈوروں سے
موم سارا چوس لیتی ....!
صرف جسموں کو گرمانے بری ہے دھوپ
یہ تو سانسوں کے دھاگوں کو جلا سکتی نہیں
کل بھی تھے پا بہ سلاسل ہم
آج بھی آزادی پر جھوم سکتے نہیں ....!!
بھوک کھا گئی ہے کتنی زندہ جانوں کو
آج بھی بھوک کا پیٹ لپ لپا رہا ہے
اور نہ جانے اس کے نوکیلے دانت
کسی شہہ رگ پر زہر آلودہ زباں رکھ دے
اس سے پہلے ہم اک جگہ بیٹھ کر
آؤ............
مکتی کی تدبیریں کریں............!!!

☆☆☆

نئی تحریر

فلک شگاف ان اونچی عمارتوں کے تلے
پناہ گزیں گھروں میں جو پھوس کے بیٹھے
سسکتے رینگتے مزدور کے دِلوں سے اب
کٹورے بھر کے نچوڑوں لہو میں ساروں کا
پھر دیواروں پہ صاف وستھری
بلند آسمان کو چھوتی
اُچھالتا جاؤں..........!
نئی تحریریں
احساس کچھ دِلائیں گی..........!!

☆☆☆

سلسلہ

زندگی ارنا بھینسا ہے

میرے ہاتھوں

لال کپڑا تھما کر چھوڑا گیا ہے

جس سے مجھ کو لڑنا ہے

جیت جاؤں تو فاتح کہلاؤں

ورنہ............

بیوگی اور یتیموں کا سلسلہ بن کر

رہ جاؤں............!

☆☆☆

ریکھائیں

دہکتے دوزخی صحرا کے ان کسانوں کی
ہتھیلیاں بھی کوئی جا کے دیکھ آئے
بتائے ان کے یہ چولہے کب مسکرائیں گے
پڑھے کوئی تو ان کی کالی ریکھائیں............!

☆☆☆

قیدِ اَنا

دیکھ ڈالو
تم ہر اک
جنگل
ہر اک صحرا میں اب
کوئی کراہنے لگا ہے
شب کی چادر اوڑھ کر
اپنی انا کی قید میں
جستجو میں
سُرخ کرنوں کی۔

☆☆☆

اجنبی قدموں کی چاپ

گرم سانسیں جو خوشبوؤں میں بسیں
میری نتھنوں سے بار ہا الجھیں
انگلیوں کے وہ لمس کو شاید
میرا احساس جانتا ہے ابھی
آج محسوسیت سماعت کی
ڈوبتی چاپ سُن بھی سکتی ہے
اجنبی دو قدم جو لوٹ گئے
میری جانب جو آ کے لوٹ گئے

☆☆☆

مشینیں

مشقتوں کی سلگتی ان چمنیوں پہ جھکے
مشیں نما مزدور
ہے جن کی سانسوں میں
کوئلے کی منّوں دُھول
جن کے پھیپھڑے اور آنتیں
مختلف گیسوں کی آماجگاہ
بٹھائے کون انہیں
پاس دو گھڑی اپنے
کہ غیرتوں کو ملے
کوئی کفن کالا

☆☆☆

شام کے اُداس منظر

گنجان جھاڑیوں کی سرسراہٹ
سوکھے پتوں کی کھڑکھڑاہٹ
کیچڑ بھری آنکھوں میں گمبھیر سناٹا
خوابوں کے ٹوٹتے ہوئے
مایوس قدموں کی
مدھم ہوتی ہوئی آوازیں
شریر کا لہو اتھل پتھل
شام کے اُداس منظروں پر
خونی پرند کے پنجے
سعیٔ لاحاصل تاب کہاں سے لائے
قلم، دوات، سوکھنے سے پہلے
اتنی گویائی دے
صفحۂ قرطاس پر خون اُگلے
ورنہ پھر
دشاؤں کا
اک ایک دروازہ
فصیل بن جائے گا۔

☆☆☆

آخری ہچکی تلک

میں نے تو یہی سمجھا
ہر اک ہچکی پر
تم نے ہی یاد کیا ہے مجھے..........!
اور..........
یہ اعتبار
آخری ہچکی تلک
قائم رہے
تو بہتر ہے..........!!

☆☆☆

دُعا............

میں کہ اک انسان ہوں
جس کو بخشی گئی ہے اشرفیت
اور جس کو بخشا گیا ہے قرآنِ معظم
جس کا میں پیروکار ہوں
آج جب کہ سِنِ بلوغیت کو پہنچا ہے میرا شعور
دیکھتا ہوں
ہر طرف مذاہب کے لگے میلے
ہر کوئی اپنی ''میں'' کی تعریف میں مگن
ہر کسی کو اپنی شئے سانچہ کر دکھانے کی لگن
اپنے دائرے سے ہٹ کر
کوئی سوچ نہیں سکتا
ایک ساعت کے لیے بھی

ہر طرف مذہب کے نام پر

اوہام وخرافات

اور اساطیر واصنام پرستی کا بول بالا ہے

میں پناہ مانگوں ان مذاہب سے

ہر کوئی بائبل، قرآن اور گیتا کے پنوں سے

منفرد ترجمانی

اپنے طور پر کی ہے

میں بھی ڈھل جاؤں

ذاتیت کے مذاہب میں

ایک اور نیا شوالہ بنالوں

اس سے پہلے

اک عرفاں عطا کر مجھے............!

☆☆☆

شاطر (6 / دسمبر کے نام)

میں جہاں ہوں
ہیں وہاں
سیاست کی بے توجہیاں
معاشیات کی بے ترتیبیاں
اور اخلاقی نظام تتر بتر
غیر مطمئن ہے ہر اک آدمی
غیر محافظ ہر اک شئے ہے
مایوسی و بے زارگی کی جھولتی لاشیں
زندگی کے نام پر جینے کو ترستی لاشیں......
میں جہاں ہوں
ہیں وہاں
میرے ملک کے راہبر
فتوحات اور غلبوں کی آس میں اکثر
حکمتوں اور مصلحتوں سے
شاطروں کی عجیب چالوں سے
الجھنوں کو دیس کی
کوشاں تو ہیں
روز و شب سلجھانے میں......مگر......!

☆☆☆

یہ میرا گھر نہیں

درجنوں اینٹوں سے اُٹھائی
چند فولادی دیواریں
اور کھپریلوں سے
سجائی ہوئی ایک چھت
ایک دروازہ
چند کھڑکیاں
جس پر خوش رنگ وروغن......!
مگر......
میں نے اندر
بہت اندر جھانک کر دیکھا
اس کے اندر
احساس تھا
نہ جذبہ کوئی!
اس کو گھر کہہ رہے ہو تم؟
یہ میرا گھر نہیں...........!

☆☆☆

سیاہ اُمید کا ماتم

جشن کے اس مبارک موقعہ پر
آج آؤ کہ ہم بھی فکر کریں
تا کہ اک انقلاب برپا ہو............!
مصنوعی نیکیوں کی لاشوں کو
گاڑ دیں مصنوعی اخلاقیت کی قبروں میں
آج آؤ کہ ہم بھی فکر کریں
تا کہ اک انقلاب برپا ہو............!
قید ہیں جو بھی فاقوں میں
ہے سیاہ دامنِ اُمید جن کا
مفلسی کر چکی ہے اپاہج جنہیں
جن کی روحیں بدن سے بھی بیمار
کوچ کر جانے تن سے جو تیار
سٹہ، گانجا، افیون اور شراب

ہیں ملوث جن میں بے حدوحساب
اُن کے گوشِ گذار کردیں آج
ہم مسیح تو نہیں کہ پھونک دیں منتر
کوئی منصف، کوئی رہبر، فلسفی بھی نہیں
جو کہ کرتے علاجِ گردش ایام
فہم وادراک ہی مِلا ہم کو
انسانیت کی اعلیٰ ظرفی کا
ہیں جس کے بل بوتے پر کمر بستہ
آج آؤ کہ ہم بھی فکر کریں
تا کہ اک انقلاب برپا ہو............!
پھر بڑھائیں قدم اُن رہبروں کی طرف
ہر جگہ پہ سناسنوں کو رکھے
جو کہ آرام سے ہیں بیٹھے ہوئے
دیش کے اپنے ساہوکاروں کو

جو کہ بے رحم اور حریص بھی ہیں
جن کی فکرِ پریشاں کوشاں ہے
دیش میں پھر کرائیں جنگ کوئی
پھر بنائیں کوئی نیا اِستان
ان کو جا کر دِلائیں ہم احساس
انس و جاں کا وطن پرستی کا
دوستی کا وفا پرستی کا
آج آؤ کہ ہم بھی فکر کریں
تا کہ اک انقلاب برپا ہو......!
یا تو پھر اُن مملکت کے رہبروں کی طرح
بھول کر ہم ہر اک تقاضے کو
آج آؤ کہ ہم بھی فِکر کریں......!
فِکر آٹم کی
بات آٹم کی......!!!

☆☆☆

ہو بھی سکتا ہے

گوتم نے بھی کچھ سوچ کر ہی
جنگلوں کی راہ لی تھی
رُشی، مُنی، پیر، پیمبر
انہیں دِشاؤں سے ہو کے آئے تھے
ہو بھی سکتا ہے............!
گوتم کی باتیں
پیر، پیمبر رام کا اُپدیش
ہم میں آ جائے
ہم بھی گوتم کی طرح
اندروں اور بیروں کا علم پا جائیں
ہو بھی سکتا ہے............!!

پھر وہی شکتی ملے ہم کو
رام، گوتم، پیر، پیمبر کی طرح
مراجعت کر جائیں
ہم بھی جنگلوں کی اور
یا...........
کیوں نہ ہم ایسا کریں
اپنے گاؤں اور شہروں کے
ہر ایک گھر میں
اک ایک جانور چھوڑ دیں
ہو بھی سکتا ہے...........!
انسانیت کا اُپدیش ملے اُن سے
ہم جسے حیوانِ ناطق سمجھتے ہیں...........!!

☆☆☆

گُم شدہ تاریخ

تاریخ کے گُم شدہ اوراق
مقید ہیں نہ جانے کون ذہنوں میں
آؤ تلاش کریں
ہم جو کہ زخم خوردہ ہیں
نہ اپنے مکمل ہونے کا فخر حاصل ہے
اور نہ ہی
دوسروں کے انسان ہونے کی
گواہی دے سکتے ہیں............!
تاریخ کے گُم شدہ اوراق
مقید ہیں نہ جانے کون ذہنوں میں
حرف بہ حرف کی شناخت کر کے
آؤ چُن لیں ہم
تا کہ
اپنے مکمل ہونے کا
کچھ ثبوت مل جائے............!

☆☆☆

گونگی دُعا

یہ انساں کے دشمن
یہ خونی درندے
یہ حوا کی بیٹی کے قاتل لٹیرے
جو جنتی ہو ماں ایسے بیٹے
خدا کوکھ ان کی
ابھی بانجھ کر دے

☆☆☆

خارِ مغیلاں

ببول کی اونچی ٹہنیوں پر

پھدک رہا ہے

ایک اکیلا پنچھی

بے چینیاں سمیٹے ہوئے

جانے کس کی رہ تکے ہے......!

شام کے ڈھلنے تک

یوں ہی

انتظار تھا جاری

نیند طاری ہوگئی پھر

اُونگھتے اُونگھتے صبح تلک

آنکھیں، زبان

اور......

سر کا کچھ مخصوص حصّہ

چھلنی ہو چکا تھا

آفتوں کا آفتاب

جب طلوع ہوا

کالی چونچوں پر لگے تھے

زرد مائل اجنبی سے پَر...........!!!

☆☆☆

اصلیت کی کھوج

تجھ کو ہی پرنام کروں میں
تیرے ہی چرن چھونا ہے مجھے......!
مانا کہ ہے تیرا روپ بسا
خشکی میں نمی میں دنیا کی
بہروپی بنا پھرتا ہے تُو
اِس جگ کے آنگن گلیوں میں
روپ کو تیرے نور کو تیرے
کیوں میں پوجوں مظہر کو......؟
مظہر ہے یہ تیرا
تُو تو نہیں......!
تجھ کو تلاشوں گا
کیوں پھول چڑھے اوروں پہ میرے
کیوں غیر کے آگے شیش جھکے......؟
کیا غیر کے آگے جھک جانا
بھگتی ہے تری
کفر نہیں..........؟

☆☆☆

میرا بھی تھا اک تاج محل

میری بھی اک ممتاز تھی
میرا بھی تھا اک تاج محل......!
جس کے بھرم پہ زندہ تھا میں
جس کے سہارے جیتا تھا میں
یادوں سے جس کی
جھیلوں میں تھے
چٹخے ہوئے خوابیدہ کنول
لہروں میں گاتی ہوئی
جیون کی نیا جاتی رہی
پھر کیا ہوا؟
اک روز ایسا طوفاں اُٹھا
آندھی چلی
سارے ٹوٹے محل

جوڑا تھا پل پل میں نے جسے
بکھرا گئی
وہ سب کچھ ہوا
پھر کیا مصائب کی برسی تھی آگ
مرجھا گئے وہ سارے کنول
خونِ جگر دے کے سینچا جسے
وہ تاج جس پر فخر تھا مجھے
وہ محل جس پر گھمنڈ تھا مجھے
پل بھر میں برباد ایسے ہوا
مٹی میں مِل کر ہوا دُھول دُھول
صحرا ہی صحرا تھا آگے پڑا
ویران راتوں میں گاتا ہے دِل
تنہائیوں میں یوں گاتا ہے دِل
میری بھی اک ممتاز تھی......!
میرا بھی تھا اک تاج محل......!

☆☆☆

احساس

یہ احساس کہ تم پاس ہو میرے
اتنے قریب کہ میں تم کو چھو بھی سکتا ہوں
تمہاری مسکراہٹ کی آوازیں
سن بھی سکتا ہوں
پر تمہیں......
مری موجودگی کا احساس بھی نہیں
صرف مجھے احساس ہے کہ
تم پاس ہو میرے

☆☆☆

دِل بن گیا میرا

بعد مدّت کے
اُن کے آ ملنے کی خوشبو
رُوح کو گدگداتی ہے
اُن سے بچھڑنے کا
وہ ایک پَل
پھیل کر صحرا سا بن گیا ہے
زخم اک تمنا کا
رِستے رِستے ناسور بن گیا ہے
جو کہ دریا سا بہتا ہے
آج اُسی موہوم تمنا پر
اُن سے ملنے
دِل تڑپتا ہے میرا

☆☆☆

نیا سورج

سر پہ نیزوں کے سائے ہیں منڈلا گئے
اور تپتی ہوئی ریت پاؤں تلے
دھوپ آ ہی گئی قہر میں الاماں
جیسے کرب و بلا اک قیامت ہوئی
قافلہ ایک چھوٹا سا حق والوں کا
اور قطاروں پہ نیزوں کی ہنستا ہوا
بے جھجک حق کی راہوں پہ تھا گامزن
سر کٹانے کے ارماں مچلتے رہے
سر میں شوقِ شہادت کا لے کر جنوں
اور کفن باندھ کر سر سے وہ چل پڑے
ایک پل کے لیے سانس بھی رُک گئی
اور زمیں آسماں بھی ٹھہر سے گئے......!
دِل تو جامِ شہادت سے سرشار تھے

ان کی تشنہ لبی پر پریشان سی
سر پٹکنے لگی ہر اک موجِ فرات
آسماں دم بخود
اور زمیں سکتہ دم
حق کے طالب بڑھے اور بڑھتے گئے
رُک سکے نہ قدم......!
جسم نیزوں سے چھلنی ہوئے تو ہوئے
پر باقی تھا عزم
جیت سے سرخرو جن کے نیزے ہوئے
اُن کے دونوں جہاں لُٹ گئے
لیکن......اہلِ وفا
زندگی بن کے
اُٹھے تو اُٹھتے گئے
ابھرتے گئے
جیسے سورج ہوں وہ.............!!

☆☆☆

پچھلے سال کی طرح

اس سال بھی گھپ اندھیرا ہے
جس میں جینا ہے مجھے
اندھی کھانا ہے مجھے
راستے ٹٹول ٹٹول کر
زندگی کی راہوں پر
پاؤں رکھنا ہے مجھے
اے مرے یارو
چلو......آگے بڑھ جاؤ تم
میں پیچھے پیچھے
آہستہ آہستہ
آؤں گا

ضرور آؤں گا
کہ پھر وہی
راہ جانی، انجانی
دے رہی ہے
دستک مرے
احساس کے دَر پر
یہ کہتی ہوئی
کہ میں آ رہی ہوں
نئے سال کی صورت میں
میری آمد پر
چند لمحے تو اندھیرا کر دو!!

☆☆☆

چاہت کا نور

کوئی کھڑکی
کوئی دروازہ میری جانب کھلتا
یا کوئی پھینکتا
آواز کی کلیاں مجھ پر
غم کی کھائی میں پڑے کیوں میں سسکتا ایسے......؟
میری آنکھیں
جو غم سے سوجھی ہیں
ہو بھی سکتا تھا......!
تاروں سی چمکنے لگتیں
اور رخساروں کے سیاہ دھبے
نور چاہت کا لیے
مسکرا پڑتے............!!!

☆☆☆

نظم............(۸رمئی انیس سو تراسی کے نام)

جب تم کونپل تھی، مُسکان تھی
نہ تم میں وہ لچک تھی، نہ مہک تھی
ہر ایک لذّت سے نا آشنا تھی تم
تب نہ جانے
یک بیک کیوں......؟
بھا گئی کونپل میرے دِل کو
وہ برسوں سے جمایا ہوا سارا لہو
کچھ ہی برسوں میں پلا بیٹھا
اور سر سبز خوابوں کی فصلیں لہلہا اٹھیں
یہاں سے وہاں تک پھیلتی چلی گئیں شادابیاں
پھر ہوا اک روز ایسے
گھنے جنگل کے فولادی ہاتھوں نے

اک درانتی پھیر دی
حیف، وہ نوخیز نازک سی کلی
بے بس ہوئی
غیر کے دامن کی زینت بن گئی
میں کہ پاگل ہوا......!
وحشی ہوا......!
بس دیکھتا ہی رہ گیا............!!!

☆☆☆

تخلیق نہ کر تاریکی کی

میں کہاں ہوں
اس کا اندازہ بھی نہیں
ہر اک لمحہ
قتل ہونے کا خدشہ ہے
کون ہے مرا قاتل
پتہ بھی نہیں.........!
میں کہاں ہوں
اس بات کے احساس کو زائل کر کے
انہی راہوں کو اپنا لوں
چھوڑ آیا تھا جنہیں
تہذیب سے پہلے

مان لوں عقل کی باتیں
چھوڑ دوں پاکیزگی دِل کی
توڑ دوں
جذبات کے مہکتے رشتوں کو
اور سرسبز درختوں پر اک درانتی پھیر دوں
اس سے پہلے
التجا ہے
تو ہی خالق ہے
روشنی کا مالک ہے
تخلیق نہ کر تاریکی کی

☆☆☆

وہ گاؤں

وہ گاؤں......!

جہاں سے آنسوؤں کا سلسلہ جاری ہوا تھا

آج تک منقطع ہو نہیں پایا

وہ گاؤں......!

جہاں کی ندیاں چاندی بہاتی تھیں

جہاں کی بارشیں مٹی کی سوندھی مہک اگاتی تھیں

جہاں کی جھونپڑیوں میں دِل کا سکون بستا تھا

سنا ہے آج

وہ گاؤں......!

شہر کی شاہراہوں سے

پگڈنڈیاں ملانے کی جستجو میں

اپنی ساکھ کھو بیٹھا

وہ گاؤں......!

جہاں سے آنسوؤں کا سلسلہ جاری ہوا تھا

آج تک منقطع ہو نہیں پایا

☆☆☆

روشنی

روشنی اے روشنی
آخر کو تیرا بھید کھلا
تو ہے مانگے کی چمک
بھیک میں دو چند کرنوں کو لیے
اپنے بوسیدہ سیاہ جسم پر لپیٹے ہوئے
روزِ ازل سے
شب گزیدہ
کتنی آنکھوں سے لہو ٹپکائی ہے
کتنے ارمانوں کو لے ڈوبی ہے تو
اے سیاہ جسم کی زنگی
ایک دِن روزِ ابد بھی آئے گا
بوند بوند کر کے تجھے
پی جائے گا
ہے اندھیرا دائمی
اور تو ہے فنا.............!

☆☆☆

فکرِ جمیل

چل ذرا راہ سروری کی طرف
فکر و فن اور آگہی کی طرف
ترک کر سب فضول کے قصے
روک لے آنسوؤں کی دھاروں کو
جو کہ بہتی ہیں صرف ماضی پر
اُٹھ ذرا کھول دے دریچوں کو
دیکھ فردا کی روشنی
پھر سے
مہر و انجم ہوں دستِ قابو میں
آج روشن ہوئی ہے فکرِ جمیل......!
کہکشاں منتظر ہے برسوں سے

اک نئے شہر کی تمنائیں
کروٹیں لے رہی ہیں سینے میں
اک جہاں اور بھی بنانا ہے
جو رواداریوں کا مسکن ہو
جو اُخوت سے سرفراز رہے
چل ذرا راہِ سروری کی طرف
فرضِ اوّل ہے آدمی کا یہی
اور انسانیت کا عنصر بھی

☆☆☆

چاندنی میرے گھر نہیں آتی......!

چاندنی دہلیز پہ آ کے رُک سی جاتی ہے
گھر کے اندر نہیں آتی
اور میں......!
آنگن میں بچھی ہریالی پر
چاندنی میں نہانا چاہوں تو
چاندنی
نور بخشے گی
مرے جسم کے ہر حصّے کو
اور......!
میرے اندر بسے اندھیرے کو
اور بھی گہرا کر جائے گی
چاندنی میرے گھر نہیں آتی......!

☆☆☆

سرحدیں (کارگل کی نذر)

کتنی کوششیں ناکام ہوئیں
کتنی آرزوئیں پائمال ہوئیں
محبتوں کی چاہ میں
سرحدوں پر
نفرتوں کی
پھر سے اک بار
خاردار باڑھ
اُگ آئی ہے

☆☆☆

سہارا

ایک ہلکی سی خوشبو
پھر تخیل کے سمندروں میں
لے ڈوبی ہے
تیرا نام......
صرف تیرا نام
ڈوبتے کو تنکے کا
سہارا ہے یہی............!

☆☆☆

چلا

پنڈتوں کی تھالیوں میں ہے رکھا
گنگا جل
ہے پوتر وہ بڑا
ہر منش کی ہے ہتھیلی،
اس کی محتاج تر
فیض کی مانند بخشا جائے گا......!
چند لمحوں کے لیے ہی کیوں نہ ہو
اونگتی ریکھاؤں کی تشنہ لبی
پا کے ہوگی بخت ور
روح پائے گی طہارت
چند لمحوں کے لیے ہی کیوں نہ ہو
ہے چلا ہر منش کی

☆☆☆

نئی فکر...... بات پرانی ہے

آج کے دور کی فضاؤں میں
جھلملاتی روشنی میسر ہے
پر نئی فکروں کو
آگے بڑھنے کے لیے
اک مکمل روشنی چاہیے......!
اپنے آباء واجداد نے
جو رہ تھی اپنائی
عشق و تصوف کی
اور فلسفیانہ فکر کی روشنیوں سے
آراستہ پیراستہ کیا تھا رستوں کو
لیکن جدیدیت کے علم برداروں نے

گمراہ کر دیا ہے

انسانیت کے رستوں سے

اور اجنبیت کی گھٹن بھر دیا ہے رشتوں میں

جب تک کہ عشق و تصوف کے

مسائل پہ بات ٹھہری تھی

نہ کوئی ہندو تھا اور نہ ہی مسلمان کوئی

ہر طرف ایک ہی نعرہ تھا

ہم ہیں بھائی بھائی............!

☆☆☆

اُجلی صبحوں میں

اُجلی صبحوں کی
مسرت بھری روشنی
شام کی دھنک کی رعنائیاں
بارشوں کی
سوندھی سوندھی
لال مٹی کی مہک
یہ سب تمہارے نام کرتا ہوں......!
اور میرے لیے کافی ہے
میں تمہیں چاہتا ہوں
شام کی رعنائیوں میں
رات کی تنہائیوں میں..........!!

☆☆☆

خاموشی

یہ جو میں چُپ کی سزا
کاٹ رہا ہوں
بس دو گھڑی
ان کے آگے
بولنے کا نتیجہ ہے
میری برسوں کی
خاموشی............!

☆☆☆

وہ الفاظ جو تم پہ لکھنے تھے

کتنے سالوں بعد
تم سے کچھ کہنے بیٹھا ہوں
تم پہ کچھ لکھنے بیٹھا ہوں
یہ وہی دن ہے
جب کہ کسی اور کا مکمل اختیار ہو گیا تھا تم پر
اب تک نہ جانے تم پر
کیا کیا کچھ لکھ چکا ہوں
پھر بھی یہ احساس کیوں ہے
تم پر ابھی بھی بہت کچھ لکھنا ہے
اور تمہیں بھی تو گلہ ہے مجھ سے
میں نے تم پر وہ سب کچھ لکھ نہیں پایا

جس کے لکھنے کا ادھیکار تھا مجھ کو
اب میں بھی تم پر
وہ سب باتیں لکھوں گا
جن میں گہرے معنی موجود ہیں
ان معنوں کا اظہار تم کر پاؤ تو اچھا ہے
مگر.............!

یہ کیا ہوا مجھ کو
وہ الفاظ جو تم پہ لکھنے تھے
اچانک بھول گیا ہوں.............!

☆☆☆

خالق

خدائے برتر نے
روزِ اوّل
سکھلائے مجھ کو
پاک اسمائے ربی
انہیں کی برکت سے
کتنی کتابیں لکھیں
قتل وخون کے
اور............
عاشقوں کے لکھے افسانے
مری زباں کا تو ہی موجد ہے
تو ہی مالک ہے
زباں کو میری
برتری دی

☆☆☆

کوششِ ناتمام

اپنے گھر کی پرانی چوکھٹ پر
اک دیا جلا کے رکھا ہے
تا کہ پاتے ہی روشنی کی کرن
چل پڑے میرے گھر کی اَور
منتظر ہوں میں آج بھی اُس کا............!
پر ہَوا ہے کہ بجھائے جاتی ہے
میری کوششوں کی ہر ایک تیلی کو
جانتا ہر کوئی ہے اُسے
کیا مآل اُس کا ہے
میں کہ
اوڑھے ہوئے لباسِ جُہل
منہمک ہوں
بس دِیا جلانے میں

☆☆☆

عرفان

میں تو ہوں
اک حقیر سی مچھلی
اور تو بیکراں سمندر ہے
رکھ پناہوں میں اپنی تو مجھ کو
ہیں مچھیرے ہر اک سو پھیلے
اپنے ہاتھوں میں ہیں لیے جالے
تُو نے چشمِ کرم نہ کیا مجھ پر
تیرا عرفان ہو مجھے کیسے

☆☆☆

سمجھوتہ

تدبیر کے ہاتھ اُٹھ نہیں سکتے
مقدر کی رسیوں سے بندھ گئے ہیں
اور مقدر میں......
گرمی، دھوپ، پریشانی
آہیں، آنسو، اور ویرانی
تدبیر کے ہاتھ بندھ گئے ہیں
کیوں نہ حالات سے سمجھوتہ کرلوں

☆☆☆

درسِ کامرانی

منصفی کا جس نے دعویٰ کر دیا
اور جس کا معترف ہے یہ جہاں
ایک ننھی سی یہ چونٹی کا وجود
ایک ہیں انصاف کی نظروں میں کیوں......؟
ہاں......!
ذرا سوچوں تو کہہ دوں
میں ہوں اک تیمور لنگ
میرے شکستہ عزم پر
مسکراتا کون ہے......؟
درس دیتا کون ہے......؟

☆☆☆

اَدھ جلے کوئلے

دُھواں اُگلتی انگیٹھی میں
پھونک مارے کوئی آ کر
اَدھ جلے کوئلوں کو
شعلہ بنا کر بھڑکا دے

☆☆☆

خدا نہ کرے

جب کبھی
تمہیں
تمہارے ہی گھر سے آنگن سے
دہلیز، دیواروں اور پردوں سے
نفرت سی ہو جائے
اور تم
سیاہ راتوں کے دامن میں
غم و ملال کے بھیانک سایوں میں
بھٹک جاؤ
اور تمہیں اُس وقت
کسی آوارہ جنگل کی
یا نوحہ کرتے صحرا کی
ضرورت ہو
تب تم
مرے گھر چلے آنا

☆☆☆

کتابِ مقدّس

ہر کوئی عنوان ہے
ہر کوئی اوراقِ کتاب
اور
الفاظ ہیں بکھرے ہوئے
ناقدوں کی قید میں
دم توڑتے
چیختے، بلبلاتے
میں کہ اک مکمل کتاب ہوں
مقدّس کتاب
میرے اندر اک رنگ اوراق ہیں
سارے الفاظ
اک رنگ ہیں
نہ کسی لفظ پر تکرار ہے
نہ تنقید ہے
کسی جملہ پر

☆☆☆

ارتقا

خواب کی طرح
تو مِلا تھا
آدھی رات میں
راستہ کی موڑ پر
میرے سائے کی مانند
اور پھر......
ڈوب گیا دائیں آنکھ میں
مری خودی کے سانچوں نے تجھے
ڈھال کر حسین پیکر میں
حسنِ تخیل کے ارتقاء پر
مرا ''میں'' کہہ بیٹھے

☆☆☆

ندامت

وہ......!

جو توانا تھیں

بھری ہوئی رگیں

نڈھال پڑ چکی ہیں اب

پتے کا کڑواسیال پانی

برابر مصروفِ عمل ہے

بھوک کا یہ شعلہ نما پانی

جلا رہا ہے تیزاب کی طرح

ہر اک عضو کو......!

گیہوں، چاول، شکر

اور گوشت

نہ جانے کیا کیا کچھ
آنتوں کی بوریوں میں بھر چکے تھے
مگر......
آج جب کہ
آنتیں خالی ہیں
افسوس ہو رہا ہے
لاغر بدن سے
دُھواں انگڑائیاں لے رہا ہے

☆☆☆

مستحکم ارادہ

میں یہاں پر قیدی ہوں
تو وہاں پر قیدی ہے
غربت نے مرے پاؤں میں زنجیر ہے پہنائی
اور ترے قدموں میں دولت کی ہے زیبائی
میرا آنا تو ممکن ہی نہیں
تُو جو چاہے تو
آ بھی سکتی ہے
سونے کی زنجیریں
غربت کی زنجیروں سے مضبوط نہیں
اک مستحکم ارادہ سے
ٹوٹ بھی سکتی ہیں

☆☆☆

مقدس پیڑ

خیالات کے
پاکیزہ مقدس پیڑ کو
بے جا خواہشات کی دیمک نے
کھوکلا کر دیا ہے
اس پر بسیرا ناممکن ہے
اس کی چھاؤں فنا بھی کر سکتی ہے
اس سے پہلے
جڑ سے گر پڑے وہ
منتقل ہو جاؤں تو بہتر ہے

☆☆☆

مشورہ

چھوڑ دو اب

گردوارے

مندر و مسجد

کے جھگڑے

اور اُن کی جگہوں پر

لہلہاتے چمن پیدا کرو

ہر طرف معطر بھری فضائیں ہوں

جس سے نسلِ انساں کے

ذہن کو

سکوں میسر ہو

تعصب کی پُرفتن ہواؤں سے

محفوظ رہے ہر کوئی

اور پھر سے......

انسانیت کی

راہ ہموار ہو جائے

☆☆☆

ساحلیں سمندر کی زینت ہیں

سمندر بوڑھا ہو چکا ہے
یہ بات کتنی غلط ثابت ہوئی ہے
جب کبھی حکم ہوا ہے
اپنی جوان لہروں کو
بھیج دیا ہے ساحلوں پر
تا کہ پاک و صاف رہیں ساحلیں
آسماں کی طرح
ساحلیں سمندر کی زینت ہیں

☆☆☆

زرّیں......حرفوں کی سیاہ چادریں

دبیز سوچوں کی اَن گنت چادریں
لپٹی ہوئی ہیں ذہن سے میرے
جس کو میں
رات، دن اور دوپہر کی دھوپ میں
نوکِ قلم سے
بہ شکل الفاظ
سفید کاغذ کے برہنہ جسم پر
اُتارتے رہتا ہوں
زریں......حرفوں کی
سیاہ چادریں

☆☆☆

اماوس کا چاند

ہے اماوس کی

رات چاروں اور

ہر طرف تاریکی ہی تاریکی

پر......

مرے روم کے دریچے میں

تیری یادوں کا چاند اُبھرا ہے

☆☆☆

اُس پار کا راہی

راہ دکھاتا

جھلملاتا اک دِیا

یک بیک یوں ٹمٹما کر بجھ گیا

راستے، گلیاں اور منزل پر

گھپ اندھیرا چھا گیا

لے کے سانسوں میں گھٹن

چل پڑا

راہی اکیلا

اُس پار کے سناٹوں میں

☆☆☆

خودشناس

دوسروں سے
خودشناس، خودآگاہ
اور...... باواقف ہوں میں
اتنی مدّت میں
میرے ''میں'' سے کوئی واقف نہ ہوسکا
ہو بھی سکتا ہے
یہ میری ہوس ہو یا کہ شہرت
کوئی بھی نام دے سکتے ہو تم
جب کہ......
میری عمر ڈھل چکی ہے
اپنی ہی ذات کی گہرائیوں میں ڈوب کر
اپنا ہی تجزیہ کرنا ہے مجھے
رازِ حائل سربستہ کو آشکار کرنا ہے مجھے

☆☆☆

عیدِ سعید

عید کی ساعت ہے
ایسے شاداں ہیں سبھی افراد میرے گھر کے
جیسے کہہ دیا ہو، موت کے فرشتے نے
بخش دیا ہے میں نے تمہیں
یا کہ پھر............
سب دُکھوں کا اختتام ہو گیا ہو
غم واَلم کے وہ منحوس منڈلاتے ہوئے بادل
جو گھیرے تھے سال بھر سے ہمیں
آج جیسے یک بیک چھٹ گئے ہوں......!
عید کی ساعت ہے
سبھی افراد میرے گھر کے
ایسے منہمک ہیں
اپنی اپنی خوشیوں میں
جیسے دنیا ہی مل گئی اُن کو
ذہن پر ہر کسی کے طاری ہے

اک عجب سا خوف
جشن کی ساعتوں کے بیت جانے کا
کاش............
کوئی پوچھتا اِس گھڑی مجھ سے
عید......، عیدِ سعید ہوئی کہ نہیں............!!

☆☆☆

اے سیاہ فاموں کے رکھوالے

بھارت رتن نلسن منڈیلا

اے سیاہ فام
نلسن منڈیلا
جوہانس برگ کی
'دور سنٹرل جیل' کے ستائیس سالہ قیدی
اے قبیلے ''تمبو'' کے باشندے
کام آ گئیں قربانیاں تیری
ٹوٹی زنجیرِ آہنی ہر اک
مل گیا تھا
زنگ آلود سلاخوں سے چھٹکارا تجھے
جس کو پگھلانے میں لگا تھا اک بڑا عرصہ
ڈھل گئیں اب وہ غلامی کی سیاہ راتیں
بن گیا تھا معزز
سال نوّے (۹۰ء) گیارہ فروری کا دن
بن کے سورج
اُبھرا تھا تری کال کوٹھری میں

محترم تھے وہ دوپہر کے تین بجے
مِل گئی اپنی قوم کی آزادی
ہر طرف گنگناتی ہے سحر
''نغمۂ آزادی''
جب کہ نکلا تھا تو کمر بستہ
مساوات و جمہوریت کو منوانے
جاویداں ہوگیا ہے تیرا نام
باب روشن ہوا ہے انسانیت کی پستک کا
ہوگیا تو نمایاں
صفحۂ عالم پر
اے مویشیوں کے چرواہا
چُن لیا تھا چُننے والے نے تجھے
اے سیاہ فاموں کے رکھوالے
مگر......آج کا اخبار
سیاہ! بالکل سیاہ
سرخیوں میں
یہ اعلان کر رہا ہے
کہ تجھ کو موت آگئی ہے (5 دسمبر 2013ء)
کیا یہ واقعی سچ ہے......؟

☆☆☆

میں کہ شاعر ہوں

میں کہ شاعر ہوں......!
حسّاس
دورِ حاضر کی نبض پر
میری نگاہیں
میں کہ شاعر ہوں......!
تڑپ اُٹھتا ہوں
کہیں بھی تباہی مچے..........!
اس بار سمندری لہریں
سونامی کا نام دے کر
کتنا کچھ برباد کر ڈالیں
جٹ گئے سب کے سب امدادی کاموں میں
میں کہ شاعر ہوں

صفحۂ قرطاس پر

چند جملے لکھ دیا ہوں

''آہ! سونامی''

اور...... مطمئن ہوں

اِس قدر

اپنے ہونے کا

حق تو ادا کر دیا میں نے

مگر............؟

☆☆☆

جان پال دوّم

آہ!
اے جان پال دوّم
اے کیتھولک عیسائیوں کے پیشوا
چھبیس سالہ تیری پیشوائی کو سلام
تُو نے وہ کچھ کر دکھایا
امنِ عالم کے لیے
متحد کر کے مسالک اور مذاہب کو بھی
اک پلاٹ فارم پر لانے کی کوشش میں
متحرک رہا تیرا مشن
کوئی دِل مجروح ہوا اور نہ کوئی معترض
سب نے مانا
امنِ عالم کا نقیب......!
موت آخر موت ہے
ہے مُفر کس کو یہاں
رنجیدہ ہے ساری دُنیا
آج تیری موت پر
اشک افشاں ہیں مری آنکھیں
اے اُمنِ عالم کے نقیب

☆☆☆

عیدِ قرباں

وَ انحَر اِنَّ شَانِئكَ هُوَالَا اَبتَر

(اور قربانی کر کہ تحقیق دشمن تیرا وہی ہے بے نسل)

عید قرباں کے

اس موقعہ پر

ہر ایک وہ لمحہ

جس کو میں نے تخلیق کیا ہے

ذہن کی وسعتوں میں

پھیلا دیا ہے

برسوں سے

آج جب کہ......

فہم وادراک مِلا ہے مجھے

وہ......!

اک اک لمحہ چُن کر

پشیماں ہوں،

حیراں ہوں،

میری ان خطاؤں کے عوض

اونٹ، بکری، بیل، گائے

قربان ہو بھی سکتے ہیں

مگر......!

سوچتا ہوں......

اپنے اندر پالا ہوا

وہ موذی جانور

''نفس امارہ''

کیوں نہ قربان کر ڈالوں

گناہوں کی دہلیز پر

☆☆☆

سال نو رہے اچھا (۱۹۹۸ء)

(عیدالفطر کا چاند نظر آنے پر)

اکتیس دسمبر کی شام
کتنی مبارک ثابت ہوئی
کھجور کی شاخ کی مانند
چند لمحوں کے لیے
ماہِ صیّام
آسماں کے دامن پر چمکایا گیا......!
کتنے چہرے پُر نور ہو گئے
کتنے جسموں کو طہارت مِل گئی
سالِ گذشتہ کی آخری شام
نیک مصروفیت عطا کر گئی
پُر عقیدت ساعتوں کے ساتھ

سالِ نو کی شروعات مبارک ثابت ہوئی

تب میرے قلب سے

بس یہی دُعا نکلی

سالِ نو، رہے اچھا............!!

خوش حال رہے میرے دیش کا ہر اک بچّہ

یارب............

سالِ نو، رہے اچھا............!!!

☆☆☆

ایک سوال

میز پر بکھرا ہوا

اَن گنت کتابوں کا ہجوم

اور............!

گلدانوں میں مرجھائے ہوئے سوکھے گلاب

اُن کے گیسوئے پریشاں کی طرح کپڑے مرے

جو کہ کھونٹی پر ٹنگے ہیں............!

منتظر ہیں......

کہ اُن کے بکھرے ہوئے مقدّر کو

کون آ کے دے گا ترتیب

کیا یہی میں سوچ کر

راتیں بسر کرتا رہوں............؟

کیوں میری سوچوں کا دائرہ ہوگیا محدود............!!

☆☆☆

مجرم

فُٹ پاتھ کی ننگی سڑک پر
میلا کچیلا
ادھ مَرا سا آدمی
رات کی تاریکیوں میں
سرگوشیاں کرتے ہوئے
کوئلے سے
کسی نام کا پہلا حرف
حرفِ آخر کی طرح
لکھ دیا ہے
تا دَمِ صبح
خوش رنگ وروغن
ایک پختہ عمارت میں
مجرم پکارا جائے گا..........!

☆☆☆

سالِ نو کی نظمیں

انیس سو تراسی برس کا (۱۹۸۳ء)
اک مکمل سال
جس کے قدموں پر
چند لمحوں کا اندھیرا پھینکا گیا تھا
جو............
قدم قدم نقش چھوڑے
بوند بوند پیاس لیے
زندہ دِل
تپتا سسکتا ہوا صحرا
جلتا ہوا دریا بن کر
لمحہ لمحہ انیس سو چوراسی (۱۹۸۴ء)
کی صورت میں ڈھل گیا ہے

☆☆☆

جہاں تک آثر سعید کی نظم نگاری کا تعلق ہے ان کی نظموں کے مطالعہ سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ موصوف نے جدید نظم نگاری کے تقاضوں کے تحت نظمیں لکھی ہیں اور پوری دیانت داری کے ساتھ اسے برتا ہے اور اس کی ہیئت اور تکنیک کو بہ حسن وخوبی نباہا ہے۔ آثر سعید اپنی نظموں میں اپنے مافی الضمیر کو علائم وابہام اور استعاروں کے ذریعہ پردہ ڈالنے، قاری کے ذہن کو بوجھل بنانے، معنی ومفہوم کو سمجھنے میں کسی طرح کی کوفت یا جھنجلاہٹ پیدا کرنے کے بجائے سیدھے سادے اور نہایت سلیقہ مند انداز میں پیش کرتے ہیں۔ جس کی بدولت نظموں میں سلاست وسادگی کے ساتھ ساتھ معنویت پیدا ہو جاتی ہے۔ دراصل یہی اچھی اور سچی شاعری کی پہچان ہے۔

—ڈاکٹر بی محمد داؤد محسن

آثر سعید اپنی آزاد نظموں کو مظہر فطرت کے مختلف خارجی روپ، داخلی معنویت سے ہم آہنگ کر کے شعری پیکر میں ڈھال دیتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ انسان کو اپنے اندر ڈوب کر سراغ زندگی پانے کی دعوت بھی دیتے ہیں۔ اسی لئے یہ نظمیں حقیقت نگاری، فکری اور متصوفانہ زاویوں کا بڑی سادگی اور صداقت سے احاطہ کرتی ہیں اور ان کی بدولت عبودیت وروحانیت کی بیکراں لہریں زیرِ سطح رواں ہوتی ہیں۔

—سرقاضی سید قمرالدین قمر

ہماری دوستی کے دوران آثر سعید کے بے شمار افسانے، غزلیں اور نظمیں نظر سے گذرتی رہیں۔ لیکن ایک انوکھا فن میں نے ایسا دیکھا جو دوسرے شعرا میں کم پایا جاتا ہے۔ روزنامہ پاسبان کی ملازمت کے دوران مشہور صحافی راز امتیاز صاحب نے ان کی اس خصوصیت کی جانب توجہ مبذول کروائی تھی۔ وہ خصوصیت تھی ان کی آزاد شاعری، انہوں نے مجھے بتایا تھا کہ آثر سعید میں آزاد شاعری کا جوہر اونچے درجے کا ہے۔ مرحوم راز امتیاز صاحب کی رائے حرفِ آخر کا درجہ رکھتی ہے۔

—مشتاق سعید

Quba-e-Zarreen (Azad Nazmein)
by Asar Sayeed

arshiapublicationspvt@gmail.com